BUDC-111
Mir Taqi Mir
Ka Khusoosi Mutala

میر تقی میرؔ کا خصوصی مطالعہ

ڈسپلن آف اردو، اسکول آف ہیومنٹیز
اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی

بلاک

3

شعری خدمات (اول)

بلاک 3 کا تعارف	122
اکائی 7 میر تقی میرؔ کی غزل گوئی	123
اکائی 8 میر تقی میرؔ کی قصیدہ نگاری	139
اکائی 9 میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری	155
اکائی 10 میر تقی میرؔ کی مرثیہ نگاری	165

بلاک 3 تعارف

تیسرا بلاک **''شعری خدمات (اول)''** کی پیشانی کے ساتھ چار (۴) اکائیوں (اکائی نمبر ۷ تا ۱۰) کو محیط ہے۔ ساتویں اکائی ''میرؔ کی غزل گوئی کا'' کے عنوان سے مخصوص کی گئی ہے۔ جس میں میر تقی میرؔ کی غزل گوئی کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر ان کی غزلوں کی خصوصیات، امتیازات، شعری اختصاصات اور اس کی قدر قیمت کو پیش کیا گیا ہے۔ آٹھویں اکائی ''میر تقی میرؔ کی قصیدہ نگاری'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ نویں اکائی ''میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری'' کے نام سے مختص ہے۔ اور دسویں اکائی ''میر کی مرثیہ نگاری'' کے نام معنون کی گئی ہے۔ یہ تینوں اکائیاں میرؔ کے ان شعری اصناف کا احاطہ کرتی ہیں جن میں وہ عمومی سطح سے مقبول و معروف نہیں ہوئے۔ یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیائے ادب میں ان کی غزل گوئی دیگر شعری اصناف پر حاوی رہی۔ لہٰذا خصوصی طور سے اس بلاک میں میرؔ کی غزل گوئی کے ساتھ ساتھ ان کی قصیدہ نگاری، مثنوی نگاری اور مرثیہ نگاری پر بھی مستقل اکائیاں مخصوص کر کے ان کی شاعری کی ہمہ جہتی کو با اعتبار واضح کیا گیا۔

اکائی 7 میر تقی میرؔ کی غزل گوئی

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 میر تقی میرؔ کی غزل گوئی

7.3.1 میر تقی میر کی غزل گوئی کا مختصر تعارف

7.3.2 میر تقی میر کی غزل گوئی کی خصوصیات

7.3.3 ماحصل

7.4 آپ نے کیا سیکھا

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

7.6 سوالوں کے جوابات

7.7 فرہنگ

7.8 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- میر تقی میر کی غزل گوئیسے واقف ہوں ہوسکیں گے۔
- میر تقی میر کی غزلوں کے موضوعات سے آشنا ہوسکیں گے۔
- میر کی شاعری میں عشقیہ موضوعات کی انفرادیت کو سمجھ سکیں گے۔
- میر تقی میر کی غزلوں میں پوشیدہ فنی خوبیوں سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔
- اردو شاعری میں میر تقی میر کے مقام ومرتبہسے متعارف ہوں گے۔

7.2 تمہید

عزیز طلبا وطالبات! اس اکائی میں آپ اردو غزل کے عظیم شاعر میر تقی میر کی غزل گوئی کی بنیادی خصوصیات سے آگاہی حاصل کریں گے۔ اردو کی کلاسیکی شعری روایت میں میر اور غالب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ میر تقی

میر کو خدائے سخن کہا گیا۔اس بات سے میر کی عظمت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔میر نے غزل گوئی کے فن کو بام عروج پر پہنچایا اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا کہ کلاسیکی وجدید غزل میں کوئی ان کے ہم پلہ نہیں ہوسکا۔میر کو اس بات کا اندازہ تھا ،اس لئے ان کے دیوان میں متعدد اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں تعلّی کا انداز پایا جاتا ہے۔دراصل جب شاعر کسی شعر میں اپنی تعریف یا بڑائی بیان کرتا ہے تو اس کو تعلّی کہتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

میر کے بارے میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں عشقیہ موضوعات کو اس طرح بیان کیا کہ ہر پڑھنے والے کو اس میں اپنا مدعا دکھائی دیتا ہے۔غالباً اسی سبب میر کی آپ بیتی کو جگ بیتی سے موسوم کیا گیا۔اردو غزل میں میر جیسی شہرت کم شعرا کے حصے میں آئی۔ایسے شعرا میں سودا، غالب ،مومن ،میر انیس اور اقبال کا نام لیا جاسکتا ہے۔تقریباً تین سو سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میر کی شاعری کے موضوعات کو پڑھتے ہوئے ان میں تازگی اور انوکھے پن کا احساس ہوتا ہے۔ان کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع اور فنی پیش کش کا انداز نہایت دلکش اور انوکھا ہے۔

7.3 میر تقی میر کی غزل گوئی

7.3.1 میر تقی میر کی غزل گوئی کا مختصر تعارف

عزیز طلبا وطالبات!

میر تقی میر کا شمار اردو کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔میر تقی میر کے عہد کو اردو شاعری کے عہد زریں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اردو کے نامور شاعروں مثلاً ناسخ، مصحفی، ذوق، غالب ،حسرت اور فراق وغیرہ نے میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کھلے دل سے کیا ہے۔ان کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف میر کی شاعری کے قدردان ہی نہیں تھے بلکہ میر کی شاعری کو رشک کی نگاہ سے بھی دیکھتے تھے۔نمونے کے طور پر چند اشعار دیکھئے۔

مصحفی تو کہاں اور شعر کا دعویٰ
پھبتا ہے یہ انداز سخن میر کے اوپر

غلام ہمدان مصحفی

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

مرزا غالب

شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

حسرت موہانی

عزیز بچوں! یہاں ان اشعار کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ کس طرح میر تقی میر نے اپنی شاعری سے اپنے عہد اور بعد میں آنے والی نسلوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ یہاں یہ اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میر کی شاعری کی کو سمجھنے کے لئے ان کے ذاتی و خارجی حالات سے واقفیت ضروری ہے۔ آپ نے اس سے پہلے کی اکائی میں میر کے حالات زندگی اور ان کے عہد سے متعلق بنیادی معلومات حاصل کر لی ہونگی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میر کی ذاتی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میر کا زمانہ سیاسی و معاشرتی ابتری کا زمانہ تھا۔ لوٹ ماری اور خوں ریزی کا بازار گرم تھا۔ میر اس تباہی و بربادی کے چشم دید گواہ تھے۔ حرماں نصیبی اور ان خوں چکاں حالات نے ان کی شخصیت پر گہرا اثر مرتب کیا۔ یہ تمام خارجی و داخلی عوامل ان کی شاعری میں بنیادی حوالہ بن کر ابھرتے ہیں۔ میر اپنے زمانے کے سیاسی انتشار سے خود کو الگ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جب شاہ عالم ثانی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھتے ہیں تو اس دلدوز واقعہ کو شعر کے قالب میں ڈھالنے سے خود کو روک نہیں پاتے۔ دہلی کی تباہی و بربادی خود میر کی تباہی کا سامان بن جاتی ہے۔

شہاں کے کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پرتی سلائیاں دیکھیں

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

☆☆☆

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو! یہ بستی اجاڑ کر

میر کو اپنے دل کی ویرانی کا جتنا کرب تھا اتنا ہی دکھ انہیں اپنی آٹھ سو سالہ تہذیب کے اجڑنے کا بھی تھا۔ ایسے حالات میں کوئی بھی حساس شاعر اپنی ذات تک کیسے محدود رہ سکتا ہے۔ چنانچہ میر بھی اپنے زمانے کے مسائل اور اس کے غم میں برابر کے شریک نظر آتے ہیں۔ میر کی شاعری میں کرب کا یہ احساس ذاتی نہیں بلکہ اس میں

پورے عہد کا غم نظر آتا ہے۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

☆☆☆

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

مذکورہ اشعار میں تاج وتخت کے اجڑ جانے کا شور وہنگامہ تو نہیں ملتا لیکن شائستگی ووقار کے ساتھ کرب کا احساس ضرور پایا جاتا ہے۔اس نوع کے اشعار پڑھتے ہوئے قاری، میر کے غم میں خود کو برابر کا شریک پاتا ہے۔میر باقاعدہ طور پر فلسفی نہیں تھے اور نہ ان کے یہاں فلسفے کا کوئی جامع تصور تھا اور نہ ہی ان کی فکر میں گہرائی تھی لیکن زندگی کی صالح اقدار سے انہوں نے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا۔میر نے ظلم کو برا کہا اور قتل وغارت گری کی مذمت کی اور اپنے عہد کے سیاسی انتشار اور سیاسی حالات پر اپنے دل کا حال کھول کر بیان کیا۔مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے۔

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

☆☆☆

جس جا کہ خس وخار کے اب ڈھیر لگے ہیں
یاں ہم نے انہی آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں

میر اپنے عہد کے حالات پر جو رائے زنی کرتے ہیں اس کا لہجہ تیکھا اور اظہار براہ راست ہے۔میر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ناامیدی وناکامی کو اپنی کمزری نہیں بننے دیا بلکہ زندگی کے ان تلخ تجربات کو اپنی طاقت میں تبدیل کر دیا۔میر کے یہاں بے بسی ولاچاری کے احساس میں بھی ایک خاص قسم کی رفعت وبلندی کا احساس پایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

☆☆☆

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

☆☆☆

عشق کا گھر ہے میر سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

میر کی شاعری کا مرکزی محور عشقیہ جذبات واحساسات کا بیان ہے۔ان کے عشقیہ اشعار میں سوز وگداز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔دراصل میر کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے والد کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ان کے والد کا رجحان صوفیانہ عشق کی طرف تھا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر کم عمری میں ہی صوفیانہ عشق کے اسرار ورموز سے پوری طرح واقف ہوگئے اور کائنات کی ہر شے میں میر کو عشق کا جلوہ نظر آنے لگا۔کم عمری میں میر عشق میں گرفتار ہوگئے اور ان پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی۔یہی وجہ ہے کہ میر کی شاعری کے ابتدائی زمانے میں ہی عشق کی گہرائی اور مختلف کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں اور انہیں کائنات کے ذرے ذرے میں عشق کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

☆☆☆

عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو ، کہیں ہے کچھ

☆☆☆

عشق معشوق، عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلائے عشق

میر اپنے اشعار میں کہیں انسان کا خدا سے عشق اور کہیں انسان سے انسان کا عشق اور کہیں انسان کا کائنات سے رشتہ استوار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میر کائنات کی اصل روح عشق میں تلاش کرتے ہیں۔میر کا عشق میں مبتلا ہونا اور پھر جنون کی کیفیت کا طاری ہوجانا دونوں باتیں ان کی شاعری کے ارتقاء میں اہم ہیں۔میر کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جس میں وہ عشق میں بری طرح ناکام اور ہجر وفراق کا درد وکرب جھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔عشق کے اس ناکام تجربے نے ان کے اندر کبھی نہ ختم ہونے والے سوز وگداز کو جنم دیا۔نمونے کے طور پر یہ اشعار دیکھئے۔

بے اجل میر اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

☆☆☆

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب ایک سانحہ سا ہو گیا ہے

ان اشعار کو پڑھ کر میر کی بے بسی اور کرب کی شدت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مرنے سے پہلے موت کا آغوش میں لے لینا اور دل کا جانا (عشق میں گرفتار ہونے کے سبب جسم سے دل کا جدا ہو جانا) ایک دردناک تجربہ بن کر ابھرتا ہے۔ جس نے میر کو پوری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا۔ عشق کی شاید ہی کوئی کیفیت ایسی ہو جسے میر نے شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش نہ کیا ہو۔ عشق میں ناکامی کے سبب انہیں زندگی گزارنے کا سلیقہ نصیب ہوا اور ان کی عشقیہ شاعری میں ایسی گہرائی و گیرائی، درد و کسک اور طاقت و توانائی پیدا ہوئی جس نے میر کو عظمت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ میر کا غم جاناں غم دوراں بن کر ابھرتا ہے۔

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مذکورہ شعر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عشق کس طرح انسان کو جینے کا سلیقہ، شائستگی و آداب سکھاتا ہے۔ میر کے عشقیہ اشعار میں معصومیت، عاجزی و انکساری اور نیازمندی جیسے عناصر پائے جاتے ہیں۔

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

میر کے دیوان میں ایسے اشعار بھی کثیر تعداد میں ملتے ہیں جن میں محبوب کا سراپا بیان کیا گیا ہے۔ اس نوع کے اشعار کو پڑھ کر میر کے عمیق مشاہدے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ محبوب کے جسمانی خد و خال، لباس، وضع قطع، چال ڈھال، قد و قامت اور گالوں کی سرخ رنگت کو ایک عاشق کی نظر سے دیکھتے ہیں اور محبوب کی شوخی و ناز و ادا، بے اعتنائی، ظلم و ستم اور انداز گفتگو کو انوکھے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ میر جب ان تجربات و مشاہدات کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں تو وہ عشقیہ جذبے کے ابدی اظہار کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

☆☆☆

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

☆☆☆

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

میر کی شاعری میں حسن محض محبوب کا حسن ہی نہیں بلکہ فطرت اور کائنات کا حسن بھی بن جاتا ہے۔ان کا تصورِ حسن کائنات کے حسن کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔میر نے بہار کے موسم اور چمن و باغات کے تلازمات کا ایسا دلفریب منظر پیش کیا ہے کہ منھ سے بے ساختہ واہ نکلتی ہے اور قاری میر کے مشاہدے کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

☆☆☆

دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں
سیلی لگی صبا کی تو منھ لال ہوگیا

اسی طرح دنیا کی بے ثباتی اور انسانی حسن کے لازوال ہونے کا موضوع بھی میر کے یہاں کثرت سے پایا جاتا ہے۔حسنِ فطرت کی طرح کائنات بھی بے ثبات ہے۔اس بات کو میر نے تمثیلی انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اس شعر میں میر نے کتنے سادہ اور بلیغ انداز میں انسان کے فانی ہونے کا نقشہ کھینچا ہے۔دراصل کلی سے پھول بننے تک کے سفر میں ہی انسان کے زوال کی کہانی پوشیدہ ہے۔اس دنیا میں انسان کے قیام کی مدت اتنی ہی مختصر ہے جتنی ایک پھول کی۔عزیز طلبا و طالبات یہاں اس مختصر سی اکائی میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میر کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکے جو ضروری اور بنیادی باتیں ہیں صرف ان پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ میر کی شاعری ان کے ذاتی درد و غم کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے معاشی و اقتصادی اور سیاسی تبدیلیوں کی عکاس ہے اور ان کی شاعری میں دلّی کی تباہی کے درد و غم کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔اپنے عہد کے حالات کا غم اور عشق کی ناکامی نے میر کی شاعری کو خاص مقام عطا کیا۔

7.3.2 میر تقی میر کی غزل گوئی کی خصوصیات

میر نے غزل گوئی کے فن کو صرف نکھارا ہی نہیں بلکہ شعوری طور پر اپنے اشعار میں شاعرانہ وسائل کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا۔میر نے اپنے فن کو محدود نہیں ہونے دیا اور غزل کے دامن میں ہر طرح کے الفاظ کا بے لاگ استعمال کیا اور کسی بھی تجربے اور کیفیت کے اظہار کی پیش کش میں کبھی تامل نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ میر کے یہاں ہر رنگ اور ہر موڈ کے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔میر کے بارے میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ مصور غم ہیں۔ان کی شاعری میں یاس و قنوطیت کا انداز غالب ہے۔اس بات سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا

سکتا۔کلامِ میر کا بہ غور مطالعہ کئے بغیر صرف ان کے مشہور اور منتخب اشعار کی روشنی میں یہ فیصلہ صادر کرنا کہ میر ہر وقت اپنے محبوب کی جدائی میں روتے دھوتے رہتے تھے، یہ جانب دارانہ رویہ ہے۔اس نوع کے اشعار کو میر کی شاعری کا صرف ایک پہلو قرار دیا جا سکتا ہے۔جب ہم میر کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو میر کی شاعری میں ایسے ان گنت پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں جو آج بھی عام قاری کی نظروں سے مخفی ہیں۔جہاں وہ کبھی عاشق، کبھی معشوق، کبھی حسن پرست، کبھی اپنے محبوب کو چھونے کی لذت کو کھل کر بیان کرتے ہیں تو کبھی فلسفیانہ لب و لہجہ، کبھی زمانے کی بدحالی کا شکوہ اور کبھی ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کی صورت ان کے اشعار میں دیکھنے کو ملتی ہے ۔کبھی میر غم کی شدت سے نڈھال نظر آتے ہیں تو کبھی نشاط و شادمانی سے شرابور۔کبھی ان کے اشعار میں بے خودی کی کیفیت اور خود سپردگی کا انداز پایا جاتا ہے۔میر کی شاعری کے یہ تمام رنگ انہیں اردو کے دیگر شعراء سے ممتاز بناتے ہیں۔

میر کی غزل گوئی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عشقیہ موضوعات کا بیان اثر آفرینی کے ساتھ کیا ہے۔میر نے اردو غزل میں عشق و محبت اور عاشق و معشوق کے حوالے سے جو باتیں بیان کیں وہ تصوراتی ہوتے ہوئے بھی واقعاتی معلوم ہوتی ہیں۔انہوں نے حسن و عشق کی تصوراتی باتوں کو اس انداز سے بیان کیا کہ اس میں ہر پڑھنے والے کو اپنے تجربے کی گونج سنائی دیتی ہے۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

☆☆☆

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

☆☆☆

عشق اک میر بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

مذکورہ اشعار کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے دل کی باتیں ہیں۔ان اشعار میں کیفیت اور تاثیر پائی جاتی ہے۔میر کے عشقیہ جذبات و احساسات کے بیان میں سادگی و پرکاری پائی جاتی ہے۔میر عشق کی کئی منزلوں سے گزرتے ہیں۔وہ حسن و عشق کی محرومی اور نا آسودگی کی مصوری بھی کرتے ہیں اور حسن سے وابستگی کا اظہار بھی۔ان کی شاعری میں حسن سے وابستگی کا بیان محض خیالی نہیں بلکہ جیتے جاگتے حسن کے پیکر سے ہے۔

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

☆☆☆

مذکورہ شعر میں حزن و ملال کا شائبہ تک نہیں ملتا بلکہ یہ ایک نشاطیہ جذبہ ہے جس میں آسودگی و وارفتگی کی تمنا ملتی ہے۔

ہر صبح اٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو
تیرے سوائے میرا کچھ مدعا نہیں ہے

میر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ غم ہو یا خوشی، ناکامی ہو یا محرومی وہ اپنے ذاتی جذبے کو کائناتی وسعت عطا کرنے کا فن جانتے ہیں۔ میر اپنے ذاتی جذبات و تجربات کو کائنات کی ہر شے سے ملا دیتے ہیں۔ نمونے کے طور پر یہ اشعار دیکھئے۔

جب لگ گئے جھمکنے رخسار یار دونوں
تب مہر و مہ نے اپنی آنکھیں چھپا لیاں ہیں

جتنی باریکی سے میر نے کائنات کی ہر شے اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کو دیکھا تھا اتنے ہی قریب سے اپنے محبوب کو دیکھا اور سراہا تھا۔ یہ شعر دیکھئے۔

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

وہ اپنے محبوب کے ناز و ادا کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

کیا کہوں تجھ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھ میں میں نے
عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھ

میر اپنی شاعری میں گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ دراصل میر نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے ایک ایسی زبان کا سہارا لیا جو روزمرہ کی زبان سے قریب تر ہو اور اس میں تخلیقی حسن بھی موجود ہو۔ میر کا لہجہ جذبے اور اظہار کی ایک ایسی سطح کو جنم دیتا ہے جس سے کلام میں اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر دوسروں سے باتیں کر رہے ہیں۔ غالباً اسی سبب میر نے کہا تھا

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی مشہور کتاب شعر شور انگیز میں عام بول چال یا گفتگو کی زبان کے حوالے سے میر کی فنکاری کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح میر روزمرہ کی زبان کو شاعری کی زبان بنانے پر قدرت رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میر کی دنیا روزمرہ کے واقعات سے بھری ہوئی ہے اور ان واقعات کو وہ ایک جذباتی معنویت بخش دیتے ہیں۔۔۔ میر روزمرہ کے یا زبان کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی بڑائی اس بات میں ہے کہ انہوں نے روزمرّہ کو شاعری کی زبان میں بدل دیا۔ یعنی اس میں وہ قوتیں داخل کیں جو تصوراتی اور جذباتی تفریقات کا احاطہ کر سکیں، لیکن زبان کی جڑیں پھر بھی روزمرّہ ہی میں پیوست رہیں۔ انھوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا، اور اس طرح کہ آج تک اس کا بدل نہ ہو سکا۔''

شعر شور انگیز (جلد اول) شمس الرحمٰن فاروقی ص، 52-56، سن اشاعت 2006

میر اپنے افکار و خیالات کو احساس اور جذبے میں تبدیل کرنے کا فن جانتے ہیں اور اپنے اشعار میں روزمرّہ کی ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جس میں مضمون آفرینی کے ساتھ کیفیت اور اثر انگیزی بھی شامل ہوتی ہے۔ میر کا یہ لب و لہجہ ان کی شناخت میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

میر کے کلام میں فارسی آمیز زبان اور نامانوس تراکیب کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے۔ حالانکہ میر نے فارسی زبان کی روایت کو اپنایا مگر اس کو کبھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ میر نے اپنے کلام میں ہر طرح کے الفاظ و محاورات کو قلمبند کیا ہے۔ وہ زبان کا استعمال آزادی سے کرنے کے خواہاں تھے۔ میر نے اپنے جذبات و احساسات کو تجرباتی زبان میں بیان کر کے شاعری اور زبان دونوں کے لئے نئے امکانات روشن کئے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میر نے عام گفتگو کی زبان کو ادبی زبان کی صورت عطا کی۔ اس ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''میر واحد شاعر ہیں جنہوں نے ہماری زبان کے فطری اور نامیاتی عناصر کو اہمیت دی، اور اظہار مطلب کی سعی میں مناسب ترین الفاظ کو اختیار کیا اور جہاں چاہا وہاں رسومیاتی تکلف کو بالائے طاق رکھا، جہاں چاہا وہاں پر تکلف الفاظ استعمال کئے۔''

شعر شور انگیز (جلد اول) شمس الرحمٰن فاروقی، ص، 73

میر کی غزل گوئی کی ایک خصوصیت پیکر تراشی ہے۔ پیکر ایسے الفاظ کو کہتے ہیں جن سے قاری کے حواس کو بیدار کیا جاتا ہے اور قاری کسی حالت یا واقعے کی کیفیت کو بخوبی محسوس کرتا ہے۔ میر تقی میر حالات و واقعات کو اس طرح لفظی تصویروں میں پیش کرتے ہیں کہ اس کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ جیسے سب کچھ اس کے سامنے ہو رہا ہو۔ مثال کے طور پر شعر کو ملاحظہ کریں۔

چلتے ہو تو چمن کو چلئے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

مذکورہ شعر میں میر نے مناسب الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ چمن اور اس کے موسم کی مکمل تصویر ابھرتی ہے۔ بہار کا موسم، ہریالی اور بوندا باندی کی کیفیات کو سامنے لاکر باغ کی مجموعی اور موسمی صورتحال کا منظر بخوبی کھینچا گیا ہے۔

میر تقی میر اپنے کلام میں خوبصورت تشبیہات و استعارات استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات کے استعمال میں وہ سادگی کا خیال رکھتے ہیں۔ ان تشبیہات کی مدد سے میر آس پاس کی دنیا اور اپنے باطنی احساس و خیال کو خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ میر کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے دوسرے روایتی شعراء کے برعکس تشبیہات میں انوکھے پن کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے کلام میں تشبیہ کے استعمال کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ

اسی طرح میر تقی میر نے اپنی غزلوں میں استعارات سے بھی بھرپور کام لیا ہے۔ استعارات کے استعمال میں بھی میر سادگی اور ندرت سے کام لیتے ہیں۔ استعارات کے استعمال سے میر کبھی اپنے منفرد تجربے یا خیال کو پیش کرتے ہیں تو کبھی شعر کی تزئین کے لئے بھی استعارے کا استعمال کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرو وگل کے سائے تھے

ان لبوں کا جواب ہے وہ لعل
ہم تجھی سے سوال رکھتے ہیں

اس طرح صنائع بدائع اور روزمرہ کے علاوہ تشبیہات واستعارات اور پیکر تراشی سے میر کی غزل میں ایک طرف معنوی تہداری پیدا ہوجاتی ہے تو دوسری طرف یہ وسائل کلام میں حسن کا سبب بن جاتے ہیں۔ دراصل میر کے کلام میں خیال اور لفظ آپس میں اس طرح ہم آہنگ ہوجاتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ میر نے اپنی غزلیہ شاعری میں خیالات واحساسات کے اظہار لئے نئی نئی ترکیبیں اختراع کی ہیں۔ جن سے شعری زبان میں وسعت پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

اس شعر میں چشمِ خوں بستہ میر کی خودساختہ ترکیب ہے۔ اسی طرح متعدد تراکیب جیسے آہوئے رم خوردہ، چشمِ گریہ ناک، سبزۂ نورستہ، مونس تنہائی، دلِ غم دیدہ وغیرہ کا سہرا میر کے سر جاتا ہے۔ مذکورہ تمام خصوصیات میر تقی میر کی غزل گوئی کو کلاسیکی شعری روایت میں امتیاز بخشتی ہیں۔ انہی خصوصیات کے سبب میر کو خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل کہا گیا ہے۔

7.3.3 ماحصل

اردو کی کلاسیکی شعری روایت میں میر تقی میر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ میر تقی میر کا شمار عظیم شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ فارسی شعری روایت کے زیر اثر اردو غزل کا دائرہ عشقیہ موضوعات کے گرد گھومتا ہے۔ دراصل غزل بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے۔ اسی روایت کے زیر اثر میر نے اپنی غزلوں میں عشق کے موضوع کو بہت مختلف، منفرد اور انوکھے پیرائے میں بیان کیا اور غزل کے دامن کو وسیع کیا۔ ان کے عشقیہ اشعار میں موضوعاتی تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ شاید ہی انسانی جذبات واحساسات کا کوئی تجربہ یا کیفیت ایسی ہو جسے میر نے اپنی غزلوں میں پیش نہ کیا ہو۔ انہوں اپنے عہد کے سیاسی انتشار اور دلّی کی تباہی و بربادی کو بھی بہت موثر ڈھنگ سے پیش کیا۔ میر کی شاعری کیفیت کی شاعری ہے، ہر سننے اور پڑھنے والے کو لگتا ہے کہ اس کے دل کی بات کہی جارہی ہے۔ یہ میر کی اہم خوبی ہے۔ غالباً اسی سبب ان کی شاعری میں اثر آفرینی کے ساتھ ساتھ داخلی سوز وگداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ میر نے اپنی شاعری میں گفتگو کا انداز اپنایا ہے۔ وہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو روزمرہ کے قریب

اور تخلیقی حسن سے پر نظر آتی ہے۔ میر کی غزلوں کا بڑا حصہ ایسا ہے جو بظاہر تو سادہ و سلیس معلوم ہوتا ہے لیکن غور کیا جائے تو معنی و مفہوم میں تہہ داری و پرکاری نظر آتی ہے۔ میر کو زبان کے غیر معمولی استعمال پر قدرت حاصل تھی وہ مشکل اور پیچیدہ موضوعات کو بھی بہت سہل انداز میں کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ لب و لہجہ، تشبیہات و استعارات، پیکر تراشی، صوتی آہنگ اور مترنم بحروں کے فنکارانہ استعمال نے میر کی شاعری کو فن کی عظمت پر پہنچا دیا۔

7.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا/طالبات اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میر کی شخصیت اور شاعری پر ان کے عہد کے اثرات سے آگاہی حاصل کی۔
- میر کی غزلوں میں عشق کی اہمیت کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے۔
- میر کے لب و لہجہ سے واقفیت حاصل کی۔
- میر کی شاعری میں پیش کردہ موضوعات سے واقفیت حاصل کی۔
- اردو شاعری میں میر تقی میر کے مقام و مرتبے سے آگاہ ہوئے۔
- میر کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات سے آگاہ ہوئے۔

7.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ میر تقی میر کی شاعری کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کیجئے۔

2۔ میر نے اپنے عہد کی ترجمانی شاعری میں کس طرح کی ہے۔ وضاحت کیجئے

3۔ میر اپنے محبوب میں کن خوبیوں کو دیکھتے تھے؟ کسی شعر سے مثال دیجئے۔

4۔ میر کے تصور عشق پر روشنی ڈالئے۔

5 ۔ میر کی شاعری میں روز مرّہ کی زبان کی اہمیت اجاگر کیجئے۔

7.6 سوالوں کے جوابات

1۔ میر تقی میر کا شمار اردو کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ میر تقی میر کے عہد کو اردو شاعری کے عہد زریں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نا امیدی و ناکامی کو اپنی کمزری نہیں بننے دیا۔ بلکہ زندگی کے ان تلخ تجربات کو اپنی طاقت میں تبدیل کر دیا۔ میر کے یہاں بے بسی و لاچاری کے احساس میں بھی ایک خاص قسم کی رفعت و بلندی کا احساس پایا جاتا ہے۔ میر کی غزل گوئی کی اہم

خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عشقیہ موضوعات کا بیان اثر آفرینی کے ساتھ کیا ہے۔ان کا کمال یہ ہے کہ اردو غزل میں عشق ومحبت اور عاشق ومعشوق کے حوالے سے جو باتیں بیان کیں وہ تصوراتی ہوتے ہوئے بھی واقعاتی معلوم ہوتی ہیں۔حسن وعشق کی تصوراتی باتوں کو اس انداز سے بیان کیا کہ اس میں ہر پڑھنے والے کو اپنے تجربے کی گونج سنائی دیتی ہے۔میر تقی میر نے اپنی شاعری میں زبان و بیان کے حوالے سے سادگی اور سلاست سے کام لیا ہے۔ان کی شاعری مختلف شعری وسائل سے مزیّن ہے۔

2۔ میر کی ذاتی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں سے پر تھی۔سیاسی ومعاشرتی ابتری پھیلی ہوئی تھی۔لوٹ مار اور خوں ریزی کا بازار گرم تھا۔میر اس تباہی و بربادی کے چشم دید گواہ تھے۔حرماں نصیبی اور ان خوں چکاں حالات نے میر کی شخصیت پر گہرا اثر مرتب کیا۔یہ تمام خارجی و داخلی عوامل ان کی شاعری میں بنیادی حوالہ بن کر ابھرتے ہیں۔میر اپنے زمانے کے سیاسی انتشار سے خود کو الگ نہیں کر سکتے تھے۔اس لئے جب شاہ عالم ثانی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھتے ہیں تو اس دلدوز واقعے کو شعر کے قالب میں ڈھالنے سے خود کو روک نہیں پاتے۔

شہاں کے کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پرتی سلائیاں دیکھیں

میر کو اپنے دل کی ویرانی کا جتنا کرب تھا اتنا ہی دکھ انہیں اپنی آٹھ سو سالہ تہذیب کے اجڑنے کا بھی تھا۔میر کی شاعری میں یہ کرب کا احساس ذاتی نہیں بلکہ ان کی شاعری میں پورے عہد کا غم نظر آتا ہے۔اپنے شہر دلی کی تباہی کو انہوں نے اپنی شاعری میں بخوبی بیان کیا ہے۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

3۔ میر اپنے محبوب کے جسمانی خدوخال،لباس،وضع قطع،چال ڈھال،قد وقامت اور گالوں کی سرخ رنگت کو ایک عاشق کی نظر سے دیکھتے ہیں اور محبوب کی شوخی و ناز وادا،بے اعتنائی،ظلم وستم اور انداز گفتگو کو انوکھے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

گل ہو،مہتاب ہو،آئینہ ہو،خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

4۔ میر کی شاعری کا مرکزی محور عشقیہ جذبات واحساسات کا بیان ہے۔ان کے عشقیہ اشعار میں سوز وگداز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔میر اپنے اشعار میں کہیں انسان کا خدا سے عشق اور کہیں انسان سے انسان کا عشق اور کہیں انسان کا کائنات سے رشتہ استوار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا

کہ میر کائنات کی اصل روح عشق میں تلاش کرتے ہیں۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

عشق نے انہیں زندگی گزارنے کا سلیقہ بخشا جس کی وجہ سے ان کی عشقیہ شاعری میں ایسی گہرائی و گیرائی ،دردوکسک، طاقت وتوانائی پیدا ہوئی جس نے میر کو عظمت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔

5۔ میر اپنی شاعری میں گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہیں۔دراصل میر نے اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے ایک ایسی زبان کا سہارا لیا جو روزمرہ کی زبان سے قریب تر ہو اور اس میں تخلیقی حسن بھی موجود ہو۔میر کا لہجہ جذبے اور اظہار کی ایک ایسی سطح کو جنم دیتا ہے جس سے کلام میں اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر دوسروں سے باتیں کررہے ہیں۔میر اپنے افکار وخیالات کو احساس اور جذبے میں تبدیل کرنے کا فن جانتے ہیں اور اپنے اشعار میں روزمرّہ کی ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جس میں مضمون آفرینی کے ساتھ کیفیت اور اثر انگیزی بھی شامل ہوتی ہے۔میر کا یہ لب ولہجہ ان کی شناخت میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

7.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
بام عروج	:	بلندی پر پہنچنا
شیوۂ گفتار	:	بات چیت کا طریقہ
پیری	:	بڑھاپا
کحل	:	سرمہ
پھبنا	:	بھلا لگنا، سجنا
خاک پا	:	پاؤں کے نشان
تاجوری	:	بادشاہت
صالح اقدار	:	مثبت یا اچھی قدریں (values)
خس وخار	:	گھاس پوس اور کانٹے
بے اجل	:	بے وقت (موت) :

سیلی لگنا	:	تھپڑ مارنا، طمانچہ
منھ لال ہونا	:	چہرہ سرخ ہو جانا، شرمندہ ہو جانا
ثبات	:	پائدار، استقلال
مہر و مہ	:	سورج اور چاند
تفریقات	:	تفریق کی جمع، مختلف اجزاء کا ہونا
نامیاتی	:	بنیادی، اساسی، نشو و نما پانا

7.8 کتب برائے مطالعہ

1۔ شعر شور انگیز (جلد اول) — شمس الرحمٰن فاروقی

2۔ میر کا تغزل — عبدالمغنی

3۔ میر کی غزل گوئی — راشد آذر

4۔ میر کی شعری لسانیات — قاضی افضال حسین

5۔ میر تقی میر حیات اور شاعری — خواجہ احمد فاروقی

۶۔ میر تقی میر (مونوگراف) — مظفر حنفی

اکائی 8 میر تقی میرؔ کی قصیدہ نگاری

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 میر تقی میرؔ کی قصیدہ نگاری

8.3.1 ماحصل

8.4 آپ نے کیا سیکھا؟

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

8.6 سوالوں کے جوابات

8.7 فرہنگ

8.8 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا/ طالبات! اس اکائی میں آپ:

- میر تقی میر کی قصیدہ نگاری کا مطالعہ کریں گے۔
- صنفِ قصیدہ میں میر تقی میرؔ کے سرمایۂ سخن سے متعارف ہوں گے۔
- میر کے قصیدوں کی اہمیت ومعنویت اور خصوصیت سے واقف ہوں گے۔
- قصیدہ گوئی میں میر تقی میرؔ کے مقام ومرتبہ کا تعین کرسکیں گے۔
- میر کے قصیدوں کی مجموعی تعداد اور ان کے ممدوحین سے آگاہ ہوں گے۔

8.2 تمہید

عزیز طلبا/ طالبات! گذشتہ ساتویں اکائی میں آپ نے میر تقی میرؔ کی غزل گوئی کے مطالعہ سے اردو شاعری میں ان کے مراتب اور کلام میرؔ کی قدر و قیمت سے واقفیت حاصل کی۔ اب آپ اپنے کورس کی اس آٹھویں اکائی میں میر تقی میرؔ کی قصیدہ نگاری کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ میرؔ وسوداؔ کا شمار اٹھارہویں صدی کی عظیم اور انقلاب آفریں شخصیتوں میں سرفہرست ہوتا ہے۔ سوداؔ نے فن قصیدہ نگاری کو اپنی سخنوری سے معراج کمال کی انتہائی حدوں تک پہنچا دیا؛ جب کہ میر کی افتادِ طبع نے غزل کی فضاؤں کو اپنا مسکن بنایا۔ لیکن جس طرح سوداؔ غزلوں میں

بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں، میرؔ نے بھی قصیدہ نگاری میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ لہٰذا اس اکائی میں میرؔ کی قصیدہ نگاری کے محاسن و معائب کا جائزہ لیا جائے گا، اور کوشش کی جائے گی کہ صنف قصیدہ نگاری میں میرؔ کے مقام و مرتبہ کا تعین عمل میں آسکے۔ امید کہ یہ اکائی میرؔ کی قصیدہ نگاری کی تفہیم و توضیح میں آپ کے لیے معین ہوگی۔

8.3 میر تقی میرؔ کی قصیدہ نگاری

عزیز طلبا/ طالبات! میر تقی میرؔ کا کلام غزل کے ساتھ ساتھ متعدد بہ اصناف شعر کی شکل میں موجود ہے۔ جن میں قصیدہ بھی شامل ہے۔ لیکن ان کی سخن گوئی کی عظمت و بلندی اور قدر و قیمت ان کی غزل گوئی پر منحصر ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ میرؔ کی شاعری پر گفتگو اور اظہار رائے پیش کرتے ہوئے اکثر ناقدین اور تذکرہ نگاران کے قصیدوں کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ صنف قصیدہ نگاری میں میرؔ کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں، جس پر سوداؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ فائز ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد اپنی کتاب آب حیات میں لکھتے ہیں:

> ''چونکہ مطالب کی دقت مضامین کی بلند پردازی، الفاظ کی شان و شکوہ بندش کی چستی، لازمہ قصائد کا ہے، وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کا ثمر ہوتا ہے۔ اسی واسطے میرؔ صاحب کے قصیدے کم ہیں۔ اور اسی قدر درجہ میں میں بھی کم ہیں۔ انھوں نے طالبِ سخن پر روشن کر دیا ہے کہ قصیدہ اور غزل کے دو میدانوں میں دن اور رات کا فرق ہے۔ اور اسی منزل میں آکر سوداؔ اور میرؔ کے کلام کا حال کھلتا ہے۔''
>
> (آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد، نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۰۷ء، ص ۱۹۸۔۱۹۹)

واقعہ بھی ہے کہ اردو قصیدے کا ذکر آتے ہی مرزا محمد رفیع سودا کا نام ابھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے، جب کہ میر و سودا معاصر ہیں، اور باوجود اس کے کہ اس عہد میں قصیدے کا فن شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت مانا جاتا تھا، خدائے سخن میر تقی میرؔ نے محض چند قصیدوں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان چند قصیدوں میں بھی قصیدے کے اس عہد کے عصری معیار اور تقاضوں کا فقدان صاف نظر آتا ہے۔ وہ چاہے پرشکوہ الفاظ ہوں، یا مشکل زمینوں میں قصیدے کہنے کی روایت۔ چست بندشیں اور دھوم دھام کی تشبیہات اور لمبے چوڑے قصائد ان کے یہاں نہیں ملتے۔ غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ میر کو قصیدے سے فطری لگاؤ نہیں تھا، یا پھر وہ اپنی غزلوں کی طرح قصیدوں کو بھی فارسی روش سے جدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انھیں اس بات کا خیال تھا کہ قصیدے کا رائج الوقت معیار اس بات کا متحمل نہیں ہوگا، اور یہ طریق کار قبول عام کا شرف حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس ضمن میں

ڈاکٹر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''میرؔ نے قصیدے کو جذباتی شاعری کا نمونہ بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے غزلوں کی طرح اپنے قصدوں کو بھی اثر آفرینی دینی چاہی۔ وہ اس میں اتنے کامیاب نہ ہو سکے کہ لوگوں کا تنقیدی نقطۂ نظر بدل دیتے۔ لوگوں نے فارسی کے معیار تنقید سے ان کے قصیدے کو پرکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے قصیدے نظروں میں کھٹکتے رہے۔ میرؔ نے اس کھٹک کو دور کرنے کے لیے اکثر فارسی انداز اختیار کیا ہے۔ مبالغہ آرائی، مضمون آفرینی اور شوکتِ الفاظ کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے مگر جس قسم کے اسلوب بیان پر ایمان نہ ہو اور اسے برتنا پڑے تو تقلید کی شکل ہمیشہ بھونڈی رہے گی۔''

(اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر محمود الٰہی، تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ص ۲۴۲)

ناقدین اور علماے ادب کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو میرؔ کے قصیدوں کی قلت اور کم درجہ ہونے میں ان کے مزاج و مذاق کو دخیل سمجھتا ہے۔ میرؔ کی تنک مزاجی مشہور ہے۔ وہ اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ خودداری، توکل اور قناعت انھیں عزیز تھی۔ چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''امراء کی تعریف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل اور قناعت انھیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے یا خود پسندی اور خود بینی جو انہیں اپنے میں آپ غرق کیے دیتی تھی، وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔''

(آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد، نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۰۷ء، ص ۱۹۹)

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے آزادؔ کے اس درج بالا اقتباس کو نقوش لاہور کے میر تقی میرؔ نمبر میں موضوع بحث بنایا ہے، اور بعض دلائل کی روشنی میں یہ رائے قائم کی ہے کہ میرؔ کا توکل، قناعت، خود پسندی اور خود بینی اپنی جگہ، لیکن ان میں سے کوئی صفت میرؔ کو قصیدہ نگاری میں مانع نہ تھی، ورنہ وہ سرے سے قصیدہ ہی نہ کہتے۔ ان کا خیال ہے کہ ''میرؔ مصاحبت اور مدح سرائی کو نباہ نہ سکتے تھے'' انھوں نے میرؔ کے قصیدے در مدح آصف الدولہ کے ایک شعر کو محور بناتے ہوئے لکھا ہے:

''جہاں تک شاعری کا تعلق ہے قصیدے کے علاوہ مثنوی میں بھی انہوں نے مدحیہ کلام یادگار چھوڑا ہے، جس سے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچتی ہے کہ انھیں مدح وستائش سے عار نہ تھی۔ ان کے قصیدوں کے بعض اشعار سے پتہ چلتا کہ اپنے زمانے کے تصورات کے مطابق آستان وزیر کی خاک بننے کے وہ بھی متمنی تھے...:

غزل کو سن کے کہا ہم نشیں نے تجھ سا شخص
بجا ہو خاک ہو گر پیش آستان وزیر‘‘

(نقوش میر تقی میر نمبر۲۔شمارہ ۱۲۶،نومبر ۱۹۸۰ء،ادارہ فروغ اردو، لاہور،ص ۴۰۹۔۴۱۰)

میرؔ جیسے کثیر الکلام شاعر کے یہاں مذہبی قصیدوں سے قطع نظر فقط تین درباری قصیدوں کا وجود سرے سے قصیدہ نہ کہنے کے ہی مترادف ہے۔البتہ ڈاکٹر ابو محمد سحر کا یہ موقف کہ ’میرؔ مصاحبت اور مدح سرائی کو نباہ نہ سکتے تھے‘‘ کی تصدیق میرؔ کے مذہبی اور درباری ہر دو طرح کے قصیدوں سے ہوتی ہے۔اور وہ ان کے مزاج و مذاق کا بھی ایک فطری عنصر ہے۔مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی کتاب شعر الہند میں میرؔ کے قصیدوں میں اس وقت کے مسلمہ معیار، مشکل زمینوں کے استعمال، دھوم دھام کی تشبیہوں کے انصرام، الفاظ کی شان و شوکت، بندش کی چستی اور اشعار کی طوالت کے فقدان کو تسلیم کرتے ہوئے بعض امور میں میرؔ کو سوداؔ کے نہ صرف ہم پلہ بلکہ بعض موقعوں پر بڑھا ہوا ظاہر کیا ہے۔تشبیہات کی لطافت و سادگی میں وہ میرؔ کو سوداؔ کے ہم پلہ شمار کرتے ہیں۔غلو اور مبالغہ میں بھی وہ میرؔ کو سوداؔ سے کم نہیں سمجھتے۔سوداؔ کے یہاں انھیں محاکات کی کمی نظر آتی ہے؛ جب کہ محاکات کو وہ میرؔ کی طبیعت کا ایک فطری جز قرار دیتے ہیں۔میرؔ کے قصیدے در مدح حضرت علی مرتضیٰؓ ’جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل‘ اور سوداؔ کے قصیدے ’اٹھ گیا بہن ودے سے چمنستاں کا عمل‘ کی تشبیب کے موازنے کے باب میں وہ کہتے ہیں ’’میرؔ کی تشبیب کے چند شعر مرزاؔ کی طولانی تشبیب پر بھاری ہیں‘‘ ملاحظہ کیجیے:

> ’’مرزاؔ اگر چہ تشبیب میں بڑا زور طبع صرف کرتے ہیں، لیکن ایک ہی زمین میں دونوں نے بہاریہ تشبیبیں لکھی ہیں۔اور مرزاؔ نے حسب عادت بڑا زور طبع صرف کیا ہے، لیکن ایک نکتہ سنج کی نگاہ میں میرؔ کی تشبیب کے چند شعر مرزاؔ کی طولانی تشبیب پر بھاری ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ مناظر قدرت میں ہمیشہ محاکات سے کام لینا چاہیے، تاکہ جس چیز کا منظر دکھانا ہے، بعینہ اس کی تصویر سامنے آجائے، اور میرؔ نے جیسا کہ ان کی طبیعت کا فطری اقتضا ہے اپنی تشبیب میں اسی اصول سے کام لیا ہے، لیکن مرزاؔ نے متاخرین شعرائے فارسی کے تتبع میں اگر چہ اس موقع پر اپنی قوت تخئیل سے ایک عالم پیدا کر دیا ہے، لیکن اس عالم خیال میں ایک پنکھڑی کی اصلی تصویر بھی نظر نہیں آتی...‘‘
>
> (شعر الہند، مولانا عبدالسلام ندوی، حصہ اول، طبع سوم،۱۹۴۲ء، مطبع معارف اعظم گڑھ،ص ۶۷۔۶۸)

یہ حقیقت ہے کہ قصیدے کے مروجہ بعض مسلمات سے قطع نظر مجموعی طور پر جب ہم میرؔ کے قصیدوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو میرؔ کے قصیدوں میں شعریت، اعلیٰ قدریں اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔سچ تو یہ ہے اگر صنف قصیدہ نظم اور غزل کی طرح زمانے کے تغیر و تبدل کا متحمل ہوتا، اور اس

کے آلۂ معیار تبدیل ہو جاتے، تو شاید نہ اس کا رواج ختم ہوتا، اور نہ ہی ہم میرؔ کے قصیدوں کو انگلیوں پر گن سکتے۔ بہر کیف کلام میر کے بحر زخار میں بشمول ایک غیر مطبوعہ قصیدے کے ہمیں فقط آٹھ قصیدے ہی ملتے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ درمدح حضرت علی مرتضیٰؓ:

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل
رنگ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے اوجھل

۲۔ درمدح حضرت علی مرتضیٰؓ:

غنچے ہو دل پر آتے ہیں اندوہ اب مدام
پہنچے ہے مجھ کو داغ گل جنگ صبح و شام

۳۔ درمدح حضرت علی مرتضیٰؓ:

اک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال
اب تک ہے دشمنی میں مری میرا بال بال

۴۔ درمدح حضرت امام حسینؓ:

فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجھ کو شکار
ہزار کوس پہ ہے جاے اک تپیدن وار

۵۔ درمدح بادشاہ جم جاہ خاور سپاہ شاہ عالم بادشاہ:

جو پہنچی قیامت تو آہ و فغاں ہے
مرے ہاتھ میں دامن آسماں ہے

۶۔ درمدح نواب آصف الدولہ بہادر:

رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب
آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب

۷۔ درمدح نواب آصف الدولہ بہادر:

ہوا کیے ہیں زبس شکوہ فلک تحریر
سیہ ہے کاغذ مشقی کے رنگ لوح ضمیر

۸۔ درشکایت نفاقِ یارانِ زماں: (غیر مطبوعہ: دیوان اول کے قلمی نسخے سے ماخوذ)

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے الفت ہے
خراب کوچہ و بازار یاں محبت ہے

آیئے اب ہم درج ذیل سطور میں مذکورہ قصیدوں اور درج بالا مباحث کی روشنی میں میرؔ کی قصیدہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں، اور ایک قصیدہ نگار کی حیثیت سے میرؔ کے مقام و مرتبہ کے تعین کی کوشش کرتے ہیں۔

عزیز طلبا/ طالبات! اول تو میرؔ کے ان قصیدوں کے سنین کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ میرؔ نے کون سا قصیدہ کب لکھا، معلوم نہیں؛ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرؔ کے دیوان اول کے قلمی نسخے (مملوکہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، دکن) پر درج سن تصنیف ۱۱۹۲ھ اور اس میں مندرج قصیدوں کی روشنی میں علماے ادب ایک حد فاصل قائم کر لیتے ہیں کہ میرؔ کے تمام قصیدے ماسوا قصیدۂ بائیہ ''رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب'' درمدح نواب آصف الدولہ بہادر کے سبھی قصیدے لکھنؤ آنے سے قبل لکھے جا چکے تھے۔ کیوں کہ ۱۱۹۶ھ سے پہلے میرؔ کے لکھنؤ آنے کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس مفروضے کی روشنی میں دیکھا جائے تو میرؔ کی نوک قلم سے لکھنؤ آنے کے بعد صرف ایک ''قصیدۂ بائیہ'' مذکورہ ہی زیب قرطاس ہوا۔ میرؔ کے ان تمام قصائد میں قصیدے کے معروف اجزا، تشبیب، گریز، مدح، حسن خاتمہ/ دعا/ حسن طلب کا التزام کیا گیا ہے۔ البتہ حسن طلب کے حصے میں ان کی خودداری، توکل اور قناعت کا عکس صاف دیکھا جا سکتا ہے؛ وہ اپنے ممدوح کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے؛ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصیدوں میں حسن طلب کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

پہلی مثال:

کر دعا پر میرؔ اب ختم سخن
تو کہے جو کچھ کرے حق مستجاب
زیردست اس کے رہیں گردن کشاں
تا قیامت وہ رہے مالک رقاب
دوست اس کے جوش زن جیسے محیط
خاک بر سر مدعی جیسے سراب
(قصیدہ: درمدح نواب آصف الدولہ بہادر)

دوسری مثال:

دعا پر کروں ختم اب یہ قصیدہ
کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے
رہے وقت ایسا ہی روز جزا تک

کہ جو دوست تیرا ہے تو شاد ماں ہے
تری عمر ہو میرے طول امل سی
کرم کا سا سررشتہ اک تیری ہاں ہے
(قصیدہ: درمدح بادشاہ جم جاہ خاور سپاہ شاہ عالم بادشاہ)

تیسری مثال:

سن اس قماش کی مدحت کو مت سمجھیو یہ
کہ ہے غرض خز و دیبا و پرنیان و حریر
غرض یہ ہے کہ تری خاک آستان زہے
کہ اس کے رتبے کو ہرگز نہ پہنچے پھر اکسیر
وہ آستاں کہ گدا و غنی کا ہے مسجود
بقیہ عمر کرے صرف اس پہ یہ بھی فقیر
ہمیشہ ساتھ ترے دوستوں کے ہو اقبال
ترے عدو کی سدا مدبری کرے تدبیر
(قصیدہ: درمدح نواب آصف الدولہ بہادر)

میرؔ کے دو قصیدے مردف ہیں، ایک 'درمدح بادشاہ جم جاہ خاور سپاہ شاہ عالم بادشاہ' اور دوسرا 'در شکایت نفاقِ یارانِ زماں'۔ دونوں کی ردیف لفظ ''ہے'' ہے۔ البتہ قصیدہ 'در شکایت نفاقِ یارانِ زماں' میں قصیدے کے اجزا کا اہتمام نہیں ملتا ہے۔ اگر تشبیب کی بات کی جائے تو میرؔ کی تشبیبوں میں بہاریہ، عشقیہ، دنیا کی بے ثباتی اور شکایت زمانہ وغیرہ کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ تشبیب قصیدے کی تمہید کو کہتے ہیں۔ تشبیب میں چوں کہ ہر طرح کے موضوعات کی گنجائش ہوتی ہے اس لیے عموماً اس کا مدح سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا ہے، اور اس میں شاعر کو اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھانے کا بھرپور موقع بھی ملتا ہے۔ میرؔ نے قصیدہ کے اس حصے کو اس قدر تنوع کے ساتھ برتا ہے کہ ان میں مضمون کی بوقلمونی کے باعث ایک قسم کی بے ربطی اور انتشار کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ بطور مثال ان کے قصیدے 'درمدح بادشاہ جم جاہ خاور سپاہ شاہ عالم بادشاہ' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں انھوں نے آسمان کی شکایت، دنیا کی بے ثباتی، غزل اور وصف بتاں سبھی کچھ شامل کر دیا ہے۔ جس کے باعث ان موضوعات کی ایک ایسی مرکب شکل ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہر نقش تشنہ معلوم ہوتا ہے۔ بطور نمونہ اس تشبیب کے بعض اشعار ملاحظہ کیجیے:

جو پہنچی قیامت تو آہ و فغاں ہے مرے ہاتھ میں دامن آسماں ہے
کوئی آج سے ہے فلک مدعی کیا ہمیشہ مرے حال پر مہرباں ہے

عجب مخمصے میں ہوں جور فلک سے　　حوادث کے تیروں کا سینہ نشاں ہے
غزل لطف کر میؔر صاحب کی کوئی　　کہ ان کی زباں پیچ سحر بیاں ہے
کہا میں نے مطلع غزل کا یہ سن کر　　کہ ہر طرف سے جس کے لوہو رواں ہے

غزل[مطلع ثانی]

ترے ہاتھ جب تک کہ تیر و کماں ہے　　شکار زبوں کی بھی خاطر نشاں ہے
نہ پوچھ اس طلسمات عالم کی صنعت　　کہ اس آشکارا میں کیا کیا نہاں ہے
نہ کہہ خانوادے تھے یاں کیسے کیسے　　خرابہ ہی ہے جب تلک یہ جہاں ہے
چل اے طبع مشتاق وصف بتاں پر　　کہ غم ان کا دل میں مرے یک جہاں ہے
یہی شغل ہیں خوب پیش فقیراں　　کہ ذکر خدا ہے کہ وصف بتاں ہے
نہ جا اس کے خاموش رہنے پہ بلبل　　زباں غنچۂ گل کے زیر زباں ہے
نہ دے جان شیریں کو تلخی سے ناحق　　تری محنت اے کوہکن رائیگاں ہے
جگر پر جو ہیں داغ ہجراں پریشاں　　یہ گویا خزاں دیدہ اک گلستاں ہے
خط و زلف و کاکل میں دل جا کے الجھا　　نہ سمجھا یہ ناداں کہ ہندوستاں ہے
بہت ہرزہ خواں ہے گا اے میؔر تو بھی　　وظیفہ ترا کیا یہ ذکر بتاں ہے

(در مدح بادشاہ جم جاہ خاور سپاہ شاہ عالم بادشاہ)

اس قصیدے کی تشبیب میں ایک اور چیز ہے جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے؛ اور وہ ہے مطلع اور غزل کی شمولیت۔ دراصل قصیدہ ایک طویل نظم ہوتی ہے، لہٰذا اس کی طوالت سے کسی قسم کی بے رغبتی نہ پیدا ہو، اس لیے درمیان میں تازہ مطلع اور غزل کہہ کر از سرنو ایک نئی فضا ہموار کر لی جاتی ہے۔ سامان عشق کے جملہ لوازمات میں تو میؔر کو ید طولیٰ حاصل ہی ہے، تغزل ان کا بنیادی وصف ہے۔ لیکن میؔر کی تشبیب یوں ہی مختصر ہوتی ہیں، اس لیے موضوع کی تبدیلی میں عجلت کا احساس ایک خلش سی پیدا کر دیتا ہے؛ جس کی وجہ سے تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ اس جملہ معترضہ سے قطع نظر میؔر کی تشبیب کی ایک بڑی خوبی ان میں موجود اثر آفرینی کا عنصر ہے۔ سادگی اور لطافت بھی ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ مناظر قدرت کی عکاسی میں انھیں ملکہ حاصل ہے، گویا محاکات کے زور پر وہ مناظر قدرت کی ایک فطری تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں میؔر کی اس تشبیب کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے؛ انھوں نے فارسی شاعر عرفؔی کی زمین ''چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چوں بحمل'' جسے سودا نے بھی اپنے قصیدے ''اٹھ گیا بہمن ودے سے چمنستاں کا عمل'' میں نہ صرف برتا ہے، بلکہ عرفی کے اس شعر:

عرق از شبنم گِل داغ شود بر رخِ حور
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

کے مصرعے ثانی کو مستعار لیا ہے، میں بہار یہ تشبیب ان الفاظ میں باندھی ہے کہ آنکھوں کے سامنے پھولوں کی کثرت کا ایک فطری سماں سا بندھ جاتا ہے:

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل — رنگ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے اوجھل
جوش گل یہ ہے جہاں تک کرے ہے کام نظر — لالہ ونرگس وگل سے ہیں بھرے دشت وجبل
لطف روئیدگی مت پوچھ کہ میں شبہے میں ہوں — سبزہ غلطاں ہے لب جو پہ کہ خواب مخمل
سیر کر تازگی و خرمی و شادابی — خشک بھی شاخ نے اب سبز نکالی کوپل
برگ گل فیض ہوا کرتا ہے ہر اخگر کو — آگ کی گر کہیں سلگا کے رکھے ہیں منقل

دیکھیے! میرؔ نے دوسرے شعر میں کس سادگی سے پھولوں کی کثرت کے منظر کو بغیر کسی تصنع اور تکلف کے پیش کیا ہے۔ اور اگلے شعر میں سبزے کی صراحت کس خوبی سے بیان کرتے ہوئے اسے خوابِ مخمل کے مماثل قرار دیا ہے، اور لفظ غلطاں نے تو اسے اور بھی جامع اور مکمل کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ ''میں شبہے میں ہوں'' کے فقرے نے واقعیت کا ایک عجیب رنگ بھر دیا ہے۔ اگلے شعر میں بلا شبہ مبالغہ موجود ہے، مگر باوجود اس کے اس میں بھی واقعیت کا پہلو صاف ظاہر ہے۔ بظاہر خشک نظر آنے والی شاخوں سے موسم بہار میں کونپلوں کا نمودار ہو جانا، نہ خلاف عقل ہے نہ بعید از قیاس، بلکہ عین ممکنات میں سے ہے۔ آخری شعر میں بھی میرؔ نے اعتدال وتوازن کو برقرار رکھا ہے، اور چوں کہ اخگر یعنی انگارے کو رنگ وروپ میں برگِ گل، سرخ پھولوں کی پتیوں سے مماثلت حاصل ہے؛ گویا اسے فیض سے برگ گل بنا لینا قطعی تصرف بے جا نہیں۔ میر کی ایک عشقیہ تشبیب کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجیے:

اک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال — اب تک ہے دشمنی میں مری میرا بال بال
میں مر گیا فراق میں پر اب یہ کیا ہے ظلم — جیتی گڑی ہے ساتھ مرے حسرت وصال
آیا ہے یاد قیس بہت اب کہ ہوں بتنگ — اس کے بھلاوے مجھ کو نہیں چھوڑتے غزال
یک روز بے نقاب ہوا تھا تو صبح کو — اب تک ہے آفتاب جہاں تاب پر زوال

عزیز طلبا/ طالبات! صنف قصیدہ میں تشبیب سے مدح کی طرف اس طرح آنا کہ موضوع کے بدل جانے کا احساس نہ ہو، گریز کہلاتا ہے۔ گویا یہ تشبیب اور مدح کے مابین ایک غیر محسوس جوڑ ہوتا ہے۔ اس میں شاعر کو بڑی چابک دستی اور ہنر مندی سے کام لینا ہوتا ہے۔ تاہم ہم میرؔ کے قصیدوں میں گریز کا عنصر کمزور دیکھتے ہیں؛ اور گریز کے اشعار میں ہمیں میرؔ کی بے دلی کا احساس ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر میرؔ کے قصیدوں میں اچھی گریز کا فقدان ہے۔ بطور نمونہ یہ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

(۱)

قلم چل ابھی چلتی تیری زباں ہے — کہ پھر بات کہنے کی فرصت کہاں ہے
ولیکن تجاوز نہ ہووے ادب سے — کہ ممدوح اب شاہ ہندوستاں ہے
دماغ اب نہیں ہے جو تمہید کریے — کہ کل رات ہے اور یہ داستاں ہے

(۲)

کب تک صفت بتوں کی خدا سے تو خوف کر — اے طبع رہ نہ اتنی بھی پابند خط و خال
پڑھ منقبت یہ شاہ کی جس سے نجات ہو — وہ شاہ جس کے ایک گدا کو ہے یہ کمال

گریز کے بعد قصیدے کا اصل حصہ 'مدح' آتا ہے۔ جس میں شاعر اپنی تمام توانائیوں کو بروئے کار لا کر اپنی تخلیقی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ میرؔ اپنے قصائد میں تشبیب کے بالمقابل مدح میں زیادہ زور طبیعت صرف کرتے ہیں۔ وہ اپنے ممدوحین کے فیوض و برکات، شجاعت و بہادری، عدل و انصاف اور ان کے متعلقات تلوار، گھوڑا اور ہاتھی وغیرہ کی تعریف میں تفصیل سے کام لے کر اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور اس تعلق سے ان کا سب سے پسندیدہ موضوع شجاعت و بہادری ہے۔ بطور نمونہ نواب آصف الدولہ کی مدح کے یہ اشعار جو نہ صرف زور بیان، شان و شوکت اور اختصار و جامعیت کے آئینہ دار ہیں، بلکہ قصیدے کی روایتی خوبیوں کی بھی بھرپور عکاسی کرتے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

ناگہاں مجھ سے لگا کہنے سروش — رہگذر سے لطف کی کر کر خطاب
ہے کریم اب بھی وزیر ابن وزیر — آصف الدولہ فلک قدر و جناب
جم حشم انجم سپہ گردوں شکوہ — مرجع خرد و کلاں عالم مآب
دست ہمت اس کا گر دربار ہو — پانی پانی شرم سے ہووے سحاب
فخر سام و رستم اس کی بندگی — داخل خدام یاں افراسیاب
جس سحر جرأت سے کھینچی ان نے تیغ — ڈھال رکھے منھ پہ نکلا آفتاب
رزم کے عرصے میں ہلچل پڑ گئی — آسماں کے خیمے کی کانپی طناب

مدح سرائی میں میرؔ نے تخئیل آفرینی، مبالغہ آرائی، جدت اور زور بیان سے کام لیا ہے۔ گھوڑے کی تعریف میں ان کی مبالغہ آرائی کی ندرت کا یہ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

کیا لکھوں اسپ سبک سیر کی اس کے تعریف — اوہم خامہ بھی لکھتے ہوئے جاتا ہے اچھل
جان یہ ہے ترے گھوڑے میں کہ تا روز جزا — گرد کو اس کے نہ پہنچے گی کبھو اس کی اجل

اک مصور نے اسے دیکھ کے دوڑایا خیال　　دیکھوں اس بادکی مجھ سے بھی سکے شکل نکل
سر و سینہ کو کمر تک تو بنایا رکھ ہاتھ　　اڑ گیا صفحہ کاغذ پہ سے چھوتے ہی کفل

میرؔ کے قصیدہ 'درشکایت نفاقِ یارانِ زماں' ان کے دیگر قصائد سے قدرے مختلف ہے۔جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جاچکا ہے کہ ان کا یہ قصیدہ قصیدے کے اجزاے ترکیبی کا پابند نہیں ہے۔ساتھ ہی اس میں 'مدح' کا عنصر بھی شامل نہیں ہے، بلکہ اس کی نوعیت تردیدی ہے؛اس کی قرأت سے ایسا باور ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے کسی سے میرؔ کی نسبت کچھ نازیبا باتیں کہیں،جن سے میرؔ کو کچھ تعلق نہ تھا، چنانچہ انھوں نے ان باتوں کی تردید میں یہ قصیدہ لکھا، اوران باتوں کو تہمت قرار دیا۔اس میں انھوں نے صفائی کا پیرائے بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ جیسے انھیں اپنے حریف سے کوئی خوف وخطر نہیں، وہ از راہ اخلاق ومروت اسے اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس میں ایک قسم کی دھمکی موجود ہے۔اس قصیدے کے بعض اشعار ملاحظہ کیجیے:

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے الفت ہے　　خراب کوچہ و بازار یاں محبت ہے
دروغ گوئی سے دو آشنا لڑا دینا　　کہاں کی رسم ہے یہ گر یہی مروت ہے
سخن کی خوبی کے میدان کا ہوں میں رستم　　مقابلے کو مرے ان میں کس کی طاقت ہے
بہ احمدے کہ بلا میم اس کو کہتے ہیں　　اسی کی شرق سے لے تا بہ غرب امت ہے
بہ مرتضےٰ کہ پیمبرؐ سے اس کو ہے خویشی　　بہ فاطمہ کہ کنیز اس کی ایک عصمت ہے
بہ آں امام کہ قسمت میں اس کی زہر ہوا　　بہ آں حسین کہ وہ بیکس شہادت ہے
بہ عزتے کہ جو سنتی ہو نام ذلت کا　　بہ ذلتے کہ وہ کہتی ہو کیسی عزت ہے
قسم ہے میرے تئیں ان تمام قسموں کی　　جو میں نے کچھ بھی کہا ہو یہ مجھ پہ تہمت ہے
جو کچھ کہا ہے کنھوں نے غلط کہا ہے گا　　کسو سے رنجش بیجا نہ میری طینت ہے
اگر یہ عذر ہو مقبول تو تو خیر ارنہ　　حریف ہونے کا میرے نتیجہ خفت ہے
کہاں تلک میں کروں اس نفاق کا شکوہ　　خموشی اب تو ہے اولیٰ کہ اس میں راحت ہے

بہر کیف میرؔ کے قصیدوں کے مجموعی جائزے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ میرؔ کے قصیدے اپنے معاصر سوداؔ اور دیگر قصیدہ نگاری کے علم برداروں سے مرتبے میں کم ہیں۔ان کے قصیدوں کی تشبیبیں ہوں، یا مدح وگریز؛ شوکت الفاظ اور زور بیان میں کم رتبہ ہیں۔مگر یاد رہے کہ ایسا بھی نہیں کہ میرؔ کے قصیدے الفاظ وتراکیب کی شان شوکت، مبالغہ آرائی اور قوت تخئیل سے بالکل ہی عاری ہیں۔دراصل علوے مضامین میں اتحاد کا فقدان ان کے قصیدوں کو کم رتبہ بنا دیتا ہے۔ورنہ تشبیہات واستعارات کی ندرت، سادگی ولطافت اور محاکات کے عناصر انھیں بعض موقعوں پر دیگر قصیدہ نگاروں اور اپنے معاصر سوداؔ سے بھی آگے لا کھڑا کرتے ہیں۔لیکن مجموعی طور پر یہ عناصر انھیں سوداؔ وغیرہ کے مدمقابل لا کھڑا کرنے سے قاصر ہیں۔میرؔ دراصل مظاہر کائنات کی ہر شئے کو ایک

مخصوص داخلی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کے قائل ہیں، اور وہ اپنے اس فطری میلان سے کسی صورت دست بردار نہیں ہو سکتے؛ وہ مظاہر کائنات کے عکس میں خون دل سے رنگ بھرنے کے قائل ہیں؛ جب کہ قصیدہ نگاری بالکل مختلف فن ہے، جسے وہ کامیابی سے نباہ نہیں سکے ہیں۔ اور غالباً انھیں خود بھی اس بات کا احساس تھا؛ اسی لیے لکھنؤ میں تقریباً تیس سال کے قیام اور درباروں سے وابستگی کے باوجود انھوں نے صرف اور صرف ایک قصیدہ لکھا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ میرؔ جیسے استاد، قادرالکلام اور بسیار سخن شاعر کی قصیدہ نگاری کی قدرت کے باب میں فقط آٹھ قصیدوں کی روشنی میں کوئی حتمی حکم نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ سوداؔ کے معاصرین میں سوداؔ کے بعد وہ میرؔ ہی ہیں جن کے قصائد سے صرف نظر ممکن نہیں۔ آخر میں میرؔ کے قصیدے در مدح امام حسین سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے، جن میں میرؔ نے پرشکوہ الفاظ اور عمدہ تراکیب کا نہایت خوبصورت استعمال کیا ہے:

به سینہ سوزی داغ و به آتش ہجراں — به آہ سرد سحر گاہی و به نالہ زار
به سرد مہری شیریں به کینہ خسرو — به گرم جوشی فرہاد و سختی کہسار
به عشق دیر به طوف حرم به سعی تمام — به لوح مشہد عاشق به سوز شمع مزار
به دستگیری چاک و به بے قراری جیب — به سینہ کاوی دشنہ به زخم دامن دار
به ضعف جسم نزار و به طاقت سرکش — به جان عاشق مسکیں که یار پر ہے نثار
به اضطراب چراغ و به دشمنی نسیم — به خاطر دم آخر که اس سے ہے بیزار
قسم ہے میرے تئیں ان تمام قسموں کی — که تجھ کو علم ہے ان سب کا کیا کروں میں شمار

8.3.1 ماحصل

عزیز طلبا و طالبات! مندرجہ بالا سطور میں میرؔ کے قصائد کا تجزیہ مختلف پیرایۂ بیان میں کیا گیا ہے؛ جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قصیدہ نگاری میں میرؔ کا مقام نہ صرف اپنے معاصر سوداؔ سے کم مرتبہ ہے، بلکہ بعض دوسرے قصیدہ نگاروں مثلاً ذوق و مومن و غالب سے بھی میرؔ پیچھے ہیں۔ حالاں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرؔ کے قصیدوں میں مبالغہ آرائی، تشبیہات و استعارات کی ندرت، سادگی و لطافت اور محاکات کے عناصر بھی کچھ موجود ہیں؛ وہ اپنی واقعہ نگاری اور مصوری میں محاکات سے کام لیتے ہیں اور ان کے قصیدوں میں تشبیہات و استعارات نہایت سادہ اور فطری ہیں۔ مگر میرؔ کے قصیدوں میں اس وقت کے مسلمہ معیار، مشکل زمینوں کے استعمال، دھوم دھام کی تشبیہوں کے انصرام، الفاظ کی شان و شوکت، بندش کی چستی اور اشعار کی طوالت کے فقدان نے انھیں قصیدے کے میدان میں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اسی سبب اردو قصیدہ نگاری میں انھیں امتیازی نہیں فقط انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ دراصل میرؔ کی طبیعت قصیدے کے لوازمات اور اس کے مسلمہ معیار کی متحمل ہی نہ تھی۔ میرؔ کی افتادِ طبع نے غزل کی فضاؤں کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا، لہٰذا ریزہ خیالی اور ایجاز و اختصار نے ان کے قصیدوں کو نقصان پہنچایا۔ اسی لیے انھوں نے قصیدے کو فن کے بجائے فقط ایک صنف کی حیثیت سے برتا ہے۔

8.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا/ طالبات اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میر کے ممدوحین سے واقفیت حاصل کی۔
- صنفِ قصیدہ میں میر تقی میرؔ کے سرمایۂ سخن سے متعارف ہوئے۔
- میر کے قصیدوں کی اہمیت و معنویت اور خصوصیت سے آگاہی ہوئی۔
- قصیدہ گوئی میں میر تقی میرؔ کے مقام و مرتبہ کے تعین میں مدد ملی۔
- میر تقی میرؔ کی قصیدہ نگاری کے حسن و قبح سے واقف ہوئے۔

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ میر کے ممدوحین کے نام اور ان کے قصائد کی مجموعی تعداد بیان کیجیے۔

۲۔ میرؔ کی تشبیب میں محاکات کی نشاندہی اشعار کی روشنی میں کیجیے۔

۳۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے کن باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے تشبیب میں میرؔ کو سوداؔ سے بڑھا ہوا بتایا ہے؟

۴۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں میرؔ کے قصیدوں کی قلت اور کم رتبہ ہونے کی کیا وجوہ بیان کی ہیں؟

۵۔ میرؔ کے قصائد کے حسن و قبح کا اظہار کرتے ہوئے ان کی قصیدہ نگاری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

8.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ میرؔ کے قصیدوں کا اثاثہ بہت ہی مختصر ہے۔ انھوں نے فقط آٹھ قصیدے ہی لکھے ہیں؛ جن میں سات مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ ہے۔ میرؔ کے ممدوحین میں حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؓ دو مذہبی شخصیتیں، اور دو شاہ، مغل بادشاہ ''شاہ عالم'' اور نوب اودھ'' آصف الدولہ'' شامل ہیں۔ تفصیل یہ ہے: در مدح حضرت علی مرتضیٰؓ (تین قصیدے) در مدح حضرت امام حسینؓ (ایک قصیدہ) در مدح بادشاہ جم جاہ خاور سپاہ شاہ عالم بادشاہ (ایک قصیدہ) در مدح نواب آصف الدولہ بہادر (دو قصیدے) در شکایت نفاقِ یارانِ زماں (ایک قصیدہ)

۲۔ محاکات اور واقعہ نگاری سے متعلق میرؔ کے قصیدے در مدح حضرت علی مرتضیٰؓ کی تشبیب کے یہ شعر:

جوشِ گل یہ ہے جہاں تک کرے ہے کام نظر — لالہ و نرگس و گل سے ہیں بھرے دشت و جبل
لطف روئیدگی مت پوچھ کہ میں شبہے میں ہوں — سبزہ غلطاں ہے لب جو پہ کہ خواب مخمل
سیر کر تازگی و خرمی و شادابی — خشک بھی شاخ نے اب سبز نکالی کوپل
برگ گل فیض ہوا کرتا ہے ہر اخگر کو — آگ کی گر کہیں سلگا کے رکھے ہیں منقل

ملاحظہ کیجیے؛ میرؔ نے ان اشعار میں کس سادگی اور خوبی سے پھولوں کی کثرت کے منظر کو کسی تصنع اور تکلف کے بغیر پیش کر دیا ہے۔ وہ سبزے کی صراحت بیان کرتے ہوئے اسے مخمل کے مشابہ قرار دیتے ہیں، جسے لفظ غلطاں نے اور بھی مکمل کر دیا ہے۔ ان میں ''میں شبہے میں ہوں'' کے فقرے نے واقعیت کا ایک عجیب رنگ بھر دیا ہے۔ اگلے دو شعروں میں بلا شبہ مبالغے کی آمیزش ہے، لیکن اس میں بھی واقعیت کا پہلو واضح ہے؛ اور بظاہر خشک نظر آنے والی شاخوں سے موسم بہار میں کونپلوں کا نمودار ہو جانا، ایک فطری عمل ہے، جو واقعہ کے خلاف نہیں بلکہ ممکنات میں سے ہے۔ اسی طرح انگارے کو رنگ و روپ میں سرخ پھولوں کی پتیوں سے، مشابہت حاصل ہے؛ لہٰذا اسے برگ گل تصور کرنا قطعی تصرفِ بے جا نہیں۔

۳۔ مولانا عبد السلام ندوی نے میرؔ کے قصیدوں میں اس عہد کے معیار، مشکل زمینوں، دھوم دھام کی تشبیہوں، پر شکوہ الفاظ، بندش کی چستی اور اشعار کی طوالت کے فقدان کو تسلیم کیا ہے؛ اور سوداؔ کے قصیدہ 'اٹھ گیا بہن و دے سے چمنستاں کا عمل' کی تشبیب میں بالمقابل میرؔ محاکات کی کمی کو محور بنا کر میرؔ کے قصیدہ 'جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل' کی تشبیب کو بڑھا ہوا بتایا ہے؛ وہ کہتے ہیں ''میرؔ کی تشبیب کے چند شعر مرزاؔ کی طولانی تشبیب پر بھاری ہیں''

۴۔ مولانا محمد حسین آزاد اول مطالب کی دقت مضامین کی بلند پردازی، الفاظ کی شان و شکوہ اور بندش کی چُستی، کو قصیدوں کا لازمہ قرار دیتے ہوئے ان کی عدم موجودگی کو میرؔ کے قصیدوں کی کمی اور کم درجہ ہونے کا سبب قرار دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ میرؔ کے توکل اور قناعت/ خود پسندی اور خود بینی کو ان کے قصیدوں کی قلت اور مدارج کی پستی کا سبب مانتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے: ''امراء کی تعریف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل اور قناعت انھیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے یا خود پسندی اور خود بینی جو انہیں اپنے میں آپ غرق کیے دیتی تھی، وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔''

۵۔ میر تقی میر نے جن متعدد بہ اصناف شعر میں طبع آزمائی کی ہے، ان میں قصیدہ بھی شامل ہے۔ لیکن صنف قصیدہ نگاری میں میرؔ کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں، جس پر ان کے معاصر سوداؔ فائز ہیں۔ میر تقی میرؔ نے یوں بھی بہت ہی کم قصیدے کہے ہیں۔ کلام میرؔ کے بحر زخار میں ہمیں فقط آٹھ قصیدے ہی ملتے ہیں، اور ان میں بھی قصیدے کے عصری معیار اور تقاضوں کی پاسداری نہیں کی گئی ہے۔ بالخصوص پر شکوہ الفاظ، بندشوں کی چستی، دھوم دھام کی تشبیہات کی ان کے یہاں کمی پائی جاتی ہے۔ طویل اور مشکل زمینوں میں بھی انھوں قصیدے نہیں کہے ہیں۔ دراصل میرؔ قصیدے کو جذباتی شاعری کا نمونہ بنانا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے غزلوں کی طرح قصیدوں کو بھی اثر آفرینی دینی چاہی۔ لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ میرؔ کے قصیدوں کے کم درجہ ہونے میں کسی حد تک ان کے مزاج کا بھی دخل رہا ہے۔ مجموعی طور پر

جب ہم میرؔ کے قصیدوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو میرؔ کے قصیدوں میں شعریت، اعلیٰ قدریں اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مدح سرائی میں میرؔ نے تخئیل آفرینی، مبالغہ آرائی، جدت اور زور بیان سے کام لیا ہے۔

8.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
خز	:	اون اور خالص ریشم کا بنا ہوا ایک کپڑا
دیبا	:	باریک ریشمی کپڑا
پرنیاں	:	پھول دار اور ریشمی کپڑا
حریر	:	نرم وملائم
اکسیر	:	اثر دار۔ کیمیا۔ زود اثر
وصف بتاں	:	وصف بمعنی خوبی اور بتاں بت کی جمع۔ استعارہ ہے محبوب کا
منقل	:	انگیٹھی۔ آتش دان
دشت وجبل	:	دشت بمعنی جنگل اور جبل بمعنی پہاڑ
خواب مخمل	:	مخمل کا رواں۔ مخمل کا فرش
ممدوحین	:	ممدوح کی جمع۔ جن کی تعریف کی جائے
لازمہ	:	وہ عمل جو لازم اور ضروری ہو
فقدان	:	کسی چیز کا کم ہونا یا نہ ہونا، وغیرہ
مبالغہ آرائی	:	کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا، حد سے تجاوز کرنا
مضمون آفرینی	:	ذہن سے نئی بات یا نیا خیال وضع کرنا، مبتذل مضمون کو نئے ڈھب سے بیان کرنا
دخیل	:	رسائی یا عمل دخل رکھنے والا
متمنی	:	کسی بات کی تمنا کرنا
تصنع	:	بناوٹ، تکلف، دکھاوا
محاکات	:	کسی منظر یا امر کی درست تصویر کشی۔ واقعات کی صورت گری
افروز حمل	:	افروز بمعنی چمک دمک بڑھانے والا، حمل بارہ برجوں میں سے ایک برج کا نام روشن برج۔
مدام	:	دائم، ہمیشہ، متواتر
مستجاب	:	قبول کیا گیا، مراد دعا کی قبولیت ہے

محیط	:	گھیرنے والا، احاطہ کرنے والا
طول امل	:	بے جا طوالت، کنایتاً حرس وحوس
غزال	:	ہرن کا بچہ، آہو،
سروش	:	غیبی آواز، آسمانی آواز، وحی لانے والا فرشتہ
سحاب	:	بادل، گھٹا، ابر
اخگر	:	چنگاری۔ انگارہ۔ جلتا ہوا کوئلہ۔
سبزۂ غلطاں	:	سبزہ بمعنی ہریالی، گھاس اور غلطاں بمعنی بکھرا ہوا، الجھا پوا، پریشاں،
انصرام	:	اہتمام وانتظام
نکتہ سنج	:	فصیح، خوش گفتار، سخن فہم
تتبع	:	تقلید، اتباع، نقل
قوت تخئیل	:	خیال وتصور کی قوت
افراسیاب	:	توران کا ایک قدیم بادشاہ
طناب	:	خیمے کی رسی، رسا، رسی وغیرہ
سام ورستم	:	دو ایرانی پہلوانوں کے نام
کفل	:	سرین، کمر کے نیچے کا حصہ، یہاں مراد ہے گھوڑے کو ایڑ لگانے کی جگہ سے
اسپ سبک	:	اسپ بمعنی گھوڑا، سبک بمعنی ہلکا پھلکا، مراد تیز رفتار گھوڑا
تنوع	:	رنگارنگی۔ قسم قسم کا۔ تفاوت۔ تلوّن۔
بوقلمونی	:	تنوع۔ تفاوت۔ تلوّن۔ رنگارنگی۔

8.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ آب حیات : مولانا محمد حسین آزاد

۲۔ شعرالہند (حصہ اول) : مولانا عبدالسلام ندوی

۳۔ تاریخ قصائد اردو : جلال الدین احمد جعفری

۴۔ نقوش، میر تقی میرؔ نمبر۲۔ : ادارہ فروغ اردو، لاہور

۵۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ: ڈاکٹر محمود الٰہی

اکائی 9 میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری

ساخت

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری

9.4 آپ نے کیا سیکھا

9.5 اپنا امتحان خود لیجئے

9.6 فرہنگ

9.7 سوالات کے جوابات

9.8 سفارش کردہ کتابیں

9.1 اغراض مقاصد

۱۔ اس اکائی میں ہم میر تقی میرؔ کے سوانحی کوائف اور ان کی شعری کائنات کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے

۲۔ بالخصوص میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

۳۔ اردو کی شعری روایت میں مثنویات میرؔ کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی سعی کی جائے گی۔

۴۔ میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

9.2 تمہید

خدائے سخن میر تقی میرؔ کا اصل نام محمد تقی ہیں اور میرؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کی ولادت 23-1722ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں ہوئی۔ اور 1810ء کو انتقال کر گئے۔ میرؔ کے والد سید عبداللہ ایک صوفی منش، درویش صفت انسان اور نہایت ہی پرہیز گار و متقی تھے۔ انھیں اسی بنا پر علی متقی بھی کہا جاتا تھا۔ میر تقی میرؔ کی ساری زندگی آلام و مصائب میں گزری۔ ان ہی مصائب کو میرؔ نے اپنی شاعری میں برتا جسے میرؔ کے کلام میں ایک طرح کا درد پیدا ہوا۔ انھوں نے جس سادگی اور عام بول چال کی زبان میں اپنے وردات قلبی کو پیش کیا کہ قاری کو اپنا ہی درد اور خود پر گزرنے والی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ یہی میر تقی میرؔ کی شاعری کا انفراد بھی ہے اور اسی وجہ سے کئی ایک ناقدین کا کہنا ہے کہ میر نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا۔

میر تقی میرؔ کے کارناموں میں شاعری اور نثر دونوں شامل ہیں۔انھوں نے شاعری میں کل سات دیوان تصنیف کئے ہیں جن میں چھ اردو اور ایک فارسی زبان میں ہیں۔ میر تقی میرؔ کی نثری تصانیف میں ''نکات الشعراء'' 1752ء اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہیں جو فارسی زبان میں ہے۔''ذکر میرؔ'' 1772ء فارسی میں ہی میرؔ کی خودنوشت سوانح عمری ہیں جس کا اردو ترجمہ نثار احمد فاروقی نے کیا ہے۔''فیض میرؔ'' بھی میر تقی میرؔ کی ایک مختصر نثری تصنیف ہے۔میر تقی میرؔ اردو کلاسیکی شعرا میں ایک لاثانی شاعر و فنکار ہیں جنھیں اہل اردو عرف عام میں غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اسی وجہ سے انہیں خدائے سخن کا نام دیا گیا ہے۔غزل کے علاوہ بھی میرؔ نے متعدد اصنافِ سخن میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ اپنی انفرادی شناخت کا لوہا بھی منوایا ہیں۔میرؔ غزل، قصیدہ، مرثیہ سے قطع نظر ایک اچھے مثنوی نگار بھی ہیں۔انھوں نے تیس سے زائد مثنویاں لکھ کر میر حسنؔ اور دیا شنکر نسیم سے قبل مثنوی نگاری کی روایت کو قائم کیا۔میرؔ اردو مثنوی نگاری کے ان بنیاد گذاروں میں سے ہے جنھوں نے شمالی ہند میں اردو مثنوی کو اعتبار و استحکام بخشنے میں کامیابی حاصل کیں۔میر کی مثنویوں کی تعداد پر ناقدین کو اختلاف تاہم کلیات میر تقی میر میں مثنویوں کی فہرست اس طرح سے ہیں:

۱۔ دربیان کدخدائی نواب آصف الدولہ	۲۔ دربیان ہولی وکدخدائی	۳۔ دربیان ہولی
۴۔ دربیان کدخدائی بشن سنگھ	۵۔ ساقی نامہ	۶۔ شعلۂ عشق
۷۔ ریائے عشق	۸۔ معاملات عشق	۹۔ جوش عشق
۱۰۔ اعجاز عشق	۱۱۔ خواب وخیال	۱۲۔ مورنامہ
۱۳۔ تنبہ الجہال ۱۴۔ دربیان دنیا	۱۵۔ دربیان کذب	۱۶۔ تسنگ نامہ
۱۷۔ درہجونا اہل مسمی بہ زبان زد عالم	۱۸۔ درمذمت آئینہ دار	۱۹۔ درہجوا کول
۲۰۔ دربیان مرغ بازاں	۲۱۔ کپی کا بچہ	۲۲۔ موہنی بلی
۲۳۔ دربیان بز	۲۴۔ اژدرنامہ	۲۵۔ شکارنامہ
۲۷۔ شکارنامہ دوم		

9.3 میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری

میر تقی میرؔ اردو غزل کے عظیم فنکاروں میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔اردو غزل کو نئی بلندیوں تک پہنچانے والے میرؔ درد و کرب کی اثر انگیزی، احساس وجذبات کی شدت، خیال کی گہرائی سے اپنی شاعری کو پُر اثر اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ایک عظیم غزل گو شاعر ہونے کے علاوہ میرؔ ایک اہم مثنوی نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں ۔مثنوی ہی وہ صنف ہیں جس میں میرؔ نے غزل کے بعد اپنے تخلیقی جوہر کو ظاہر کیا ہیں۔مثنویات میرؔ محض تصوراتی یا داستانوی نہیں بلکہ ایسے اظہار سے مملو ہے جو واقعی اور حقیقی ہے۔میر تقی میرؔ نے متنوع موضوعات کے

تحت مثنویاں لکھی ہیں جن میں زیادہ تر مثنویاں بہاریہ، عشقیہ اور ہجویہ نوعیت کی ہیں۔ شکارنامہ اور شکارنامہ دوم کے عنوان سے بھی دو مثنویاں ملتی ہیں۔

میرؔ نے درجہ بالا عنوانات کے تحت تیس سے زائد چھوٹی بڑی مثنویاں لکھی ہیں۔ عہد میرؔ تفریح، انتشار اور گوناگو ں مصائب کا دور تھا۔ میرؔ کی بعض مثنویوں میں اس وقت کے حالات و واقعات کی طرف بھی جگہ جگہ اشارہ ملتا ہیں ۔ میرؔ نے عشقیہ قصوں کو اپنے ذاتی درد و کرب سما کے ان میں جدت اور واقعیت پیدا کی ہیں۔ مثنوی نگاری میں میرؔ کا خاص اور اہم وصف یہ ہے کہ انھوں نے غیر فطری عناصر سے اجتناب کر کے حقائق پر مبنی شاعری پیش کی۔ روانی اور دلکشی ان کی مثنویوں کا خاصا ہیں، صنف مثنوی کو میرؔ نے فنی چابکدستی اور دلچسپی کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ کلیات میرؔ میں ''در بیان کد خدائی نواب آصف الدولہ بہادر'' کے عنوان سے پہلی مثنوی ملتی ہے۔ یہ بہاریہ مثنوی نواب آصف الدولہ کی شادی پر لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی میں مختلف تقریبات کے بیان کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ مثنوی میں میرؔ کا طرز بیان کچھ اس طرح کا ملتا ہے کہ گویا بہار اپنے جوبن پر ہو اور جوانی و سرمستی کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

ہے جہاں کہن تماشا گاہ
آصف الدولہ کا رچا ہے بیاہ

آؤ ساقی کہ کد خدائی ہے
طبع نواب ادھر کو آئی ہے

دل خوش احباب و شاد بہر دہر
بستہ آئیں دو راستہ ہے شہر

نئے سر سے جواں ہوا ہے جہاں
عیش و عشرت کے محو خرد و کلاں

ہر طرف شہر میں ہے آرائش
رہرواں کی نہیں ہے گنجائش

شیشہ باز فلک ہے آتش باز
کہکشاں سے ہوا ہوائی ساز

ماہ سے مہتاب کی ہے طرح
کس سے ہو لطف روشنی کی شرح

نہیں رستوں میں روشنی کے دیے
نجم ہیں چشم روشنی کے لیے

(در بیان کد خدائی نواب آصف الدولہ بہادر)

اگر چہ میر تقی میرؔ کی مثنویات میں فنی اعتبار سے پلاٹ، حسن مردانہ وحسن زنانہ میں کوئی خاص امتیاز نہیں دکھائی دیتا ہے تاہم میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری میں زبان و بیان، منظر نگاری اور تازگی اظہار کا عجب امتزاج ملتا ہے اور بیانیہ شاعری میں یعنی مثنوی پر بھی ان کی قادرالکلامی کا اعتراف کرنا پڑتے ہے۔ مذکورہ بالا مثنوی بہاریہ یا واقعاتی مثنوی کے زمرے میں آتی ہے اس نوعیت کی مثنویوں میں ''نسنگ نامہ''، ''خواب وخیال''، ''شکارنامہ''، ''در تہنیت کد خدائی بشن سنگھ''، ''در بیان ہولی'' وغیرہ شامل ہیں۔ میر تقی میرؔ کی ان مثنویوں میں فن کے ساتھ ساتھ اس وقت کی تہذیب کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ مختلف تہواروں پر میرؔ نے ملی جلی ہندو مسلم رسم ورواج کی عکاسی بڑی فنکاری کی ساتھ انجام دی ہے۔ میرؔ نے زیادہ تر مثنویاں قیام لکھنؤ کے دوران لکھی ہیں اس لیے ان میں نوابی رہن سہن اور عیش وعشرت کے مختلف تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثنوی ''در بیان ہولی'' اس کی ایک زندہ مثال ہیں۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

جشن ِ نو روزی اہل ہند سب
ہے یہی تب محو عشرت ہیں گے اب

شیشہ شیشہ رنگ صرف دوستاں
صحن دولت خانہ رشک بوستاں

اس چمن میں باغ پر گل سرخ و زرد
نکہت گل جھاڑیں گے سب باغ نظر

(در بیان ہولی)

میر تقی میرؔ نے عشقیہ مثنویاں بھی لکھی جن میں چند مشہور مثنویاں ''شعلہ عشق''، ''معاملاتِ عشق''، ''دریائے عشق''، ''اعجاز عشق''، ''عشق سرا'' وغیرہ ہیں۔ میرؔ کی تربیت دراصل تصوف کے ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں عشق ایک پاک جذبے سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ایسے عشق کی ابتدائی تربیت نے جو تصور میرؔ کے ذہن میں پیدا کر دیا تھا وہ نہایت ہی بلند اور اعلیٰ پائے کا تھا۔ والد کی نصیحت بھی میرؔ کو یہی تھی کہ عشق کرو، عشق سے بڑکر دنیا میں کوئی شے نہیں۔ میرؔ کے نزدیک عشق کا مقصد دنیا میں کسی چیز کا حصول کا زریعہ نہیں ہے بلکہ محبت لازوال والٰہی ہوتی ہے

۔پروفیسر وہاب اشرفی میرؔ کے عشق سے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ ''عشق'' کبھی بھی زندگی میں کامیاب نہیں ہوتا، البتہ مرکر اس کا اعجاز بالکل طلسماتی اور حیرت انگیز صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ حیرت انگیز شکل یا تو خود میرؔ اپنی اپج سے بناتے ہیں، یا کسی پرانی داستان سے مستعار لیتے ہیں۔ان کا بے نتیجہ عشق آہ وفغاں، نالہ ودرد، گریہ وزاری ،فریاد وبے قراری، شدت ضعف، حواس باختگی میں زندگی گزار کر مرجانے کا دوسرا نام ہے۔اس لیے ان کا عاشق کبھی جیتے جی وصالِ محبوب سے شاد کام نہیں ہوتا۔ بلکہ مرنے کے بعد ان کی روحیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور یہ ملاپ لازوال ہوتا ہے جس میں فراق وہجر کی کبھی کوئی کیفیت پیدا ہی نہیں کرسکتی۔

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق

عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ

عشق تھا جو رسول ہو آیا
ان نے پیغام عشق پہنچایا

عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں
ہے محمد ﷺ کہیں علیؓ ہے کہیں

عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل وکتاب رکھتا ہے

عشق حاضر ہے عشق غائب ہے
عشق ہی مظہر عجائب ہے

(معاملاتِ عشق)

میرؔ کی عشقیہ مثنویاں ان کے تصورِ عشق کی ترجمانی کرتی ہیں۔انھوں نے غزلیہ شاعری میں جس عشق کے تصور کا اظہار کیا ہے وہ ان کی عشقیہ مثنویوں میں بھی ملتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ میرؔ نے یہاں غزل کی بہ نسبت اپنے عشق ومحبت کے تصورات کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کی فضا میں حقائق کے ساتھ عشق کی اعلیٰ قدریں ملتی ہیں۔ان کی عشقیہ مثنویوں کا انجام واختتام اکثر المیہ پر ہوتا ہے یہی چیز میرؔ کے یہاں اس تصور عشق کو جوان کی ابتدائی تربیتِ تصوف کی غمازی کرتا ہے یعنی میرؔ کا عشق اور عاشق دونوں کبھی جیتے جی وصال محبوب سے شاد کام نہیں ہوتے۔

بہاریہ اور عشقیہ مثنویوں کے علاوہ میر تقی میر نے جس موضوع پر زیادہ مثنویاں لکھی ہیں وہ ہجویہ مثنویاں ہیں ۔ہجویہ موضوع کے تحت انھوں نے گیارہ مثنویاں لکھی ہیں جنھیں میرؔ کی اہم شاعری کے فن پارے کہہ سکتے ہیں اس کی ہجویہ مثنویوں میں ''در بیان مرغ بازیں''، ''در ہجو خانہ خود''، در ہجو نا اہل مسمی بہ زبان زد عالم''، ''اژدرنامہ وغیرہ شامل ہیں ۔میرؔ کے مقابلے میں ہجو کا میدان سوداؔ کو زیادہ بٹھاتا تھا کیوں کہ ہجو کہنے کے لیے فقط شگفتہ ماحول ہی نہیں بلکہ فطری شگفتہ مزاجی کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔جو میرؔ کے مزاج میں نہیں تھی ۔ہجو کہنے کے لیے جس طرح کی ظرافت اور بزلہ سنجی چاہیے میرؔ کی ہجویات میں اکثر جگہوں پر ان کے یہاں کم ملتی ہیں ۔میرؔ کے مزاج کی یہی بے اعتدالی جو عموماً ان کی ہجو کی پرخاش کا نتیجہ ہوا کرتی تھی ۔کبھی کبھی تو میرؔ بے اختیار ہو کر سختی پر اتر جاتے تھے ۔مثنوی ''اژدرنامہ'' میں تمام شعرا کو میرؔ کیڑے مکوڑے کہتے ہیں اور خود کو ''اژدہا'' تصور کر کے لکھتے ہیں کہ جب ''اژدہا'' میدان میں آتا ہے تو سب کیڑے مکوڑوں کو نگل جاتا ہے ۔

یہ موذی کئی نا خبردار فن
نئی ناگنیں جن کے ٹیکوں پہ پھن

نہیں جانتیں میں ہوں مار سیاہ
زبانہ ہے آتش کا میری نگاہ

اگر شور زاغاں سے ڈر جائے مار
تو کیا اجگروں کا رہے اعتبار

نہ کس طور اژدر کو تلواسہ ہو
حریف اس کی سوکھی سی چلپاسہ ہو

کہاں چھپکلی اژدہے سے لڑی
کس اژدر پہ ایسی قیامت پڑی

ہزار اجگر اندوہ سے جائے لٹ
ولے ایسے کیڑتے مکوڑے ہیں چٹ

(اژدرنامہ)

میرؔ کے یہاں چند واعظانہ نوعیت کی مثنویاں بھی ملتی ہیں جن میں ''تنبیہ الجہال''، ''در بیان دنیا'' اور ''در بیان کذب'' شامل ہیں ۔میرؔ کی واعظانہ مثنویوں میں اخلاقی درس کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اخلاقی پستی کو بھی سامنے لایا گیا ہے ۔مثنوی در بیان کذب میں جھوٹ کو موضوع بنا کر جھوٹ کے مختلف رویوں کو پیش کیا گیا ہے

۔اس میں میرؔ لوگوں کے مصلحتاً جھوٹ بولنے اور جھوٹ کے بغیر کسی بھی کام کو انجام تک نہ پہنچنے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔علاوہ ازیں میرؔ لکھتے ہیں کہ کچھ لوگ جھوٹ بولنے کو چالاکی و ہشیاری سمجھ کر لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور اسی فریب کاری کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔چناچہ مثنوی ''در بیان کذب'' میں لکھتے ہیں۔

اے جھوٹھ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹھ تو شعار ہوا ساری خلق کا
کیا شے کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا
اے جھوٹھ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے
اے جھوٹھ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے
جھوٹا سوار دولت ابھی کا یہ امیر
ورنہ قسم کسو کی بھی تھی حرف بارگیر
اے جھوٹھ دل مرا بھی بہت درد ناک ہے
ان کا ذبوں سے صبح نمط جیب چاک ہے

(در بیان کذب)

مثنوی ''در بیان دنیا'' کے عنوان کے تحت میرؔ نے اپنے تجربات کو مشاہدے میں لاکر پند و نصائح کا درس دیتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی کو بیان کیا ہے۔میرؔ نے جہاں فانی کی مذمت مثنوی ''در بیان دنیا'' میں یہ بتا کر کی ہے کہ اس دنیا کے مظاہرات کو ایک دن فنا پذیر ہونا ہے۔یہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں بلکہ عبرت کی جاہ ہے آج جو کچھ یہاں ہے کل وہ باقی نہیں رہتا ہر گزرتے پل کے ساتھ تغیرات نمایا ہوتے ہیں۔اور دنیا کے منظر نامے بدلتے رہتے ہیں۔انھوں نے عارضی دنیا میں رہ کر ابدی دنیا کی دعوت دی۔خدا کے یہاں نہ کوئی شہ، نہ کوئی درویش ہے ،نہ کسی کی عقل نہ کسی کی چالاکی کام آتی بلکہ سب برابر ہے۔یہاں کوئی نہ رہا ہے نہ کوئی رہنے والا ہے یعنی انسان کو ہر حال میں روبہ زوال ہونا ہے۔میرؔ کا عشق ،عشق حقیقی تھا نہ کہ عشق مجازی، وہ اس عشق سے خدا کے قربت حاصل کرنے کی اکثر بات کرتے ہیں۔ان کا عشق لاثانی اور لافانی تھا اسی لیے انھوں نے عشق حقیقی کا پرچار اپنی شاعری میں کیا ہے، چاہے وہ غزل گوئی ہو یا مثنوی نگاری۔میرؔ کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق ہی ہے ان کی پوری شاعری محبت عامہ کی دعوت دیتا ہے۔ان کے نزدیک محبت اور عشق میں زیادہ فرق نہیں کیوں کہ محبت میں جلنے کی بعد ہی انسان عشق کی لُو میں جھلستا ہے۔اس لیے میرؔ دنیا کی نفی کرتے ہوئے مذکورہ مثنوی میں یوں لکھتے ہیں۔

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل
کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل
پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے
کہوں گے کہ آگے تھا کہتا کوئی
نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی
یہ بیٹھے جو ہیں سامنے کہاں
جہاں جملہ ہے ایک بزم رواں
جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود اور باش
گدا ہو کہ ہو شاہ عالی تبار
تہہ خاک سب کا ہے دارالقرار

(در بیان دنیا)

مجموعی طور پر میر تقی میرؔ اردو کے اہم غزل گو شاعر ہونے کے علاوہ ایک اہم مثنوی نگار ہیں۔ میرؔ نے غزل کے بعد اپنی مثنویوں میں ہی اپنے تخلیقی اظہار کا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شاعری میں ان کے تازگی اظہار کی آج بھی وہی اہمیت ہے جو میرؔ کو اپنے عہد میں تھیں۔ میرؔ نے شاعری کو اپنا الگ لب ولہجہ عطا کیا ہے۔ انھوں نے غم جاناں اور غم دوراں دونوں ترکیبوں کو ایک ساتھ اپنی شاعری کے دو کناروں میں یکساں طور پر برتا ہیں۔ ان دونوں ترکیبوں میں کوئی بھی ایک حاوی نظر نہیں آتا۔ ان کے عہد کے حالات و واقعات کی عکاسی مثنویات میرؔ میں ہوتی ہیں۔ ۔ میرؔ نے اپنی مثنویات میں مختلف موضوعات کو برتا ہیں ان کے یہاں مثنویوں میں غیر فطری عناصر سے اجتناب ملتا ہے۔ میرؔ کی مثنویوں میں روانی اور دلکشی کے علاوہ جو اہم وصف ملتا ہے ان کی حقیقت نگاری ہے۔ میرؔ نے موضوعاتی سطح پر صنفِ مثنوی کو تنوع بخشا ہے اور اپنے شعری مزاج سے خاص طرز اظہار اور زبان و بیان سے اہم آہنگ کر کے مثنوی کو اہم بیانیہ صنف کا مقام عطا کیا۔ میرؔ نے جس طرز بیان و پیرایۂ اظہار کو اختراع کیا ہے۔ اس سے ان کی شناخت اردو مثنوی کی تاریخ میں ہمیشہ قائم رہے گی۔ میر تقی میرؔ اردو شاعری میں نہ صرف غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں بلکہ مثنوی نگاری میں ان کی حیثیت مسلم ہیں۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہر گز
تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

9.4 آپ نے کیا سیکھا

1۔ ہم نے میر تقی میرؔ کے سوانح کوائف اوران کے کارناموں سے متعلق جانکاری حاصل کیں۔

2۔ صنف مثنوی میں میر تقی میرؔ کے مقام ومرتبہ کے بارے میں معلومات حاصل کی۔

3۔ ہم نے میر تقی میرؔ مثنوی نگاری کا جائزہ لے کراس کی فنی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی۔۔

4۔ میرؔ کی مثنویوں کو متن کے ساتھ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔

9.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ اردو میں میر تقی میرؔ کے کل کتنے دیوان ہیں ؟

2۔ مثنوی نگاری میں میرؔ کی حیثیت کو واضح کریں؟

3۔ میرؔ نے کن کن موضوعات کے تحت مثنویاں لکھی ہیں؟

4۔ میر تقی میرؔ کی تین عشقیہ مثنویوں کے نام قلم بند کیجئے؟

9.6 فرہنگ

آلام	الم کی جمع، رنج وغم
مصائب	مصیبت کی جمع، پریشانی
کوائف	حالات، معلومات، تفصیلات
ہجو	برائی، بدگوئی، مذمت
اجتناب	پرہیز کرنا، علیحدگی
چابکدستی	چالاکی، ہوشیاری، کاریگری
مملو	بھرا ہوا، پُر
طلسماتی	جادوکا، جادو، حیرت میں ڈالنے والا
شادکام	بامراد، کامیاب، خوشحال
فراق	ہجر، جدائی، فرقت
ہجر	مفارقت، جدائی
مافوق الفطرت	ماورائے فطرت، عجیب، نادر

ظرافت	خوشی طبعی، دل لگی، مذاق
بذلہ سنجی	خوش طبعی، لطیفہ گوئی
پرخاش	رنج، لڑائی، نا اتفاقی
متقی	خداترس، پرہیزگار
صوفی منش	پارسا، پرہیزگار، متقی
آپ بیتی	خودنوشت، حالات زندگی، اپنا حال
جگ بیتی	زمانے کی حالات، دنیا کی سرگزشت
انفراد	اکیلا ہونا، تنہا ہونا
کرب	نہایت تکلیف، سختی، بے چینی
کلیات	کل کی جمع، ایک ہی شخص کی منظومات یا تصنیفات کا مجموعہ
جوبن	اٹھتی جوانی، رونق، بہار
قادرالکلامی	کلام کہنے میں جو قدرت رکھتا ہو
تہنیت	مبارک باد، مبارک دینا یا لینا
حواس باختہ	گھبرایا ہوا، بے اوسان
تصوف	علم معرفت، تزکیہ نفس کا طریقہ
تنوع	گونا گوئی، قسم قسم کا ہونا

9.7 سوالات کے جوابات

1۔ میر تقی میرؔ کے اردو دیوان کی کل تعداد چھ ہیں۔

2۔ میر تقی میرؔ غزل کے علاوہ مثنوی میں بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔

3۔ میر تقی میرؔ نے متنوع موضوعات پر مثنویاں لکھی جن میں، عشقیہ، بہاریہ، واقعاتی، ہجویہ وغیرہ لکھیں ہیں۔

4۔ میر تقی میرؔ کی تین عشقیہ مثنویوں کے نام اس طرح ہیں؛ شعلہ عشق، دریائے عشق اور معاملات عشق۔

اکائی نمبر 10 میر تقی میرؔ کی مرثیہ نگاری

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 میر تقی میرؔ کی مرثیہ نگاری

10.3.1 متن (مرثیہ میر تقی میرؔ)

10.3.2 ماحصل

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

10.5 اپنا امتحان خود لیجئے

10.6 سوالوں کے جوابات

10.7 فرہنگ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- مرثیہ نگاری میں میر تقی میرؔ کے شعری مرتبے سے واقف ہوں گے
- میر تقی میرؔ کی مرثیہ نگاری کی نمایاں خصوصیات سے متعارف ہوں گے
- میر تقی میرؔ کے مرثیوں کی قدر و قیمت سمجھیں گے
- مرثیہ کے حوالے سے میر تقی میرؔ کے عہد کو سمجھیں گے
- میر تقی میرؔ کے ایک اہم مرثیے کی قرأت کریں گے

10.2 تمہید

ادب میں مرثیہ اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں شہدائے کربلا کے مصائب اور شہادت کا ذکر ہو اور ان کے محاسن وفضائل دردوحسرت کے ساتھ بیان کیے جائیں۔عربی ادب میں مرثیہ کو قدیم صنف ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن اس میں سانحۂ کربلا سے متعلق کوئی قابلِ ذکر مرثیہ دستیاب نہیں، البتہ ایران میں شاندار مرثیے لکھے گئے ہیں۔فارسی مرثیہ گوئی میں محتشمؔ اور مقبلؔ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔اردو میں مرثیہ کا آغاز فارسی

مرثیوں کے زیر اثر دکن میں ہوا۔ دکن کے ابتدائی مرثیہ نگاروں میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، شاہی اور غواصی نظر آتے ہیں، ان بزرگ شعراء کے بعد بحری، ذوقی، امامی، علی عادل شاہ، رام راؤ سیوا اور ہاشم علی برہان پوری نے مرثیے کی مجلس عزا کو سنوارا۔ اس کے بعد ولی دکنی کا دور شروع ہوتا ہے جنہوں نے مثنوی کے پیرایہ میں ایک مرثیہ پیش کیا۔ چونکہ ولی دکنی کے زیر اثر دہلی میں اردو شاعری کو فروغ ملا لہذا ان کے بعد شمال میں جو اردو مرثیہ گو نظر آتے ہیں ان میں سکندر، حزیں، غمگین، گدا، عاجز، یک رنگ، سودا اور میر تقی میر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس عہد تک جو مرثیے لکھے جاتے رہے وہ ہیئتی بے راہ روی کے شکار تھے لیکن موضوعاتی اعتبار سے رثائی رنگ کے حامل اور واقعۂ کربلا سے متعلق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ضمیر لکھنوی سے قبل تک مرثیہ کی کوئی خاص ہیئت متعین نہیں تھی اور مرثیے مختلف اصناف نظم ''قصیدہ، مثنوی، غزل، مثلث، مربع، مخمس، مسدس'' وغیرہ کی شکل میں لکھے جاتے تھے البتہ ضمیر نے اس کے لئے مسدس کی ہیئت متعین کی جس کو اس قدر رواج ملا کہ مرثیہ کے لئے مسدس کو لازمی سمجھا جانے لگا۔ چونکہ میر تقی میر ایسے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جس میں مرثیہ کے لئے کسی خاص ہیئت کی تخصیص نہیں تھی لہذا ان کے مرثیے متعدد ہیئتوں میں ہیں۔ ان کے دستیاب مراثی میں 34 مرثیے اور 5 سلام ہیں جن کو ڈاکٹر مسیح الزماں نے ''مراثی میر'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ مرثیے مختلف ہیئتوں میں لکھے گئے ہیں، جن میں 27 مرثیے مربع، ایک ترکیب بند مثمن، دو مسدس، ایک ترجیع بند مسدس اور تین قصیدہ نما ہیں۔

10.3 میر تقی میر کی مرثیہ نگاری

میر تقی میر نے اپنے عہد کی مروجہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ میر نے غزل، مثنوی، قصیدہ جیسی نمائندہ اصناف کے علاوہ مرثیہ کی صنف کو بھی اپنی قادر الکلامی کا شرف بخشا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر تقی میر کو ان کے غزلیہ کلام کے سبب ''خدائے سخن'' کہا گیا اور محفل ادب میں ان کو مسند بالا پر بٹھایا گیا لیکن مرثیہ کے میدان میں ان کا رخش قلم اس قدر تیز رفتار نہیں جتنا غزل اور مثنوی میں چاق و چوبند ہے۔ حالانکہ میر کی عظمت کو دیکھتے ہوئے گمان یہی ہوتا ہے کہ ان کے مرثیے ان کی غزلوں سے کم نہیں ہوں گے۔ چونکہ میر کے یاسیت پسند مزاج اور مرثیہ کی غم انگیز کیفیت میں خاص مماثلت ہے۔ لیکن ان کے مراثی ان کی غزلوں کے مقابل کم درجے کے ہیں۔ کیونکہ ان میں درد و اثر کی وہ شدت نہیں پائی جاتی جو بعد کے مرثیہ نگاروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے باوجود میر تقی میر مرثیہ گوئی کو اپنے تئیں باعث امتیاز خیال کرتے تھے جس کا انہوں نے اپنے مرثیوں میں متعدد جگہ ذکر بھی کیا ہے۔ ایک مقطع ملاحظہ ہو:

ہر چند شاعری میں نہیں ہے تری نظیر
اس فن کے پہلوانوں نے مانا تجھی کو میر

پر ان دنوں ہوا ہے بہت تو ضعیف و پیر
کہنے لگا جو مرثیہ اکثر بجا ہوا

درج بالا بند کی روشنی میں اس بات کا قیاس بھی لگایا جا سکتا ہے کہ میر تقی میرؔ نے مرثیہ گوئی کا آغاز اس وقت کیا ہوگا جب وہ دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آئے اور یہاں کی سکونت اختیار کر لی۔ یہ وہ عہد ہے جب لکھنؤ کا ماحول عزاداری اور مرثیہ نگاری کے میدان میں اپنی شناخت قائم کر چکا تھا۔ میر تقی میرؔ کے معاصر نواب آصف الدولہ کی نوازشوں نے ادبی اور مذہبی محفلوں کو بارونق کر رکھا تھا۔ آصف الدولہ کی سخاوت نے لکھنؤ کو شعراء کی آماجگاہ بنا دیا تھا، آصف الدولہ خود بھی شاعر تھے اور شعراء کے قدردان بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے عہد میں عزاداری کو کافی فروغ حاصل ہوا اور مرثیہ گوئی کو خاص سمت و رفتار ملی۔ جس سے میر تقی میرؔ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے بھی اپنے عہد پیری میں مرثیہ گوئی کے رجحان کو قبول کیا اور واقعات کربلا سے متعلق اپنے شاعرانہ احساسات و جذبات نظم کئے۔

مرثیہ کے ناقدین نے اس کے آٹھ اجزائے ترکیبی (چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین) متعین کئے ہیں۔ یعنی مرثیہ کا فن یا اس کی ساخت آٹھ اجزائے ترکیبی سے تشکیل پاتی ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے مرثیہ نگاروں کے یہاں سبھی اجزاء کا التزام نہیں دکھائی دیتا چونکہ مرثیہ کی واضح صورت اور ہیئت کی تعیین بہت بعد میں ہوتی ہے۔ لہذا میر تقی میرؔ کے یہاں بین کا التزام ہی نظر آتا ہے جس کے نتیجہ میں ان کے یہاں دردانگیز بیانیہ لہجہ سنائی دیتا ہے جس کے پس پشت شدید گریہ وزاری نظر آتی ہے۔ لیکن میرؔ کے مرثیے ان کے معاصر شاعر سوداؔ کے مرثیوں کے مقابل پھیکے ہیں اور متاخرین مرثیہ گویوں کے سامنے ہلکے پھلکے ہیں۔ اس کے باوجود میر تقی میرؔ کے مرثیوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا چونکہ انہوں نے جس دور میں یہ مرثیے تخلیق کئے وہ دور فن مرثیہ کو اس کے سنہرے دور سے مربوط کرتا ہے لہذا میرؔ کے مرثیوں کی تاریخی اہمیت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

میر تقی میرؔ کے سبھی مرثیوں کا جائزہ لینے کے بعد ان کے مرثیوں کا سب سے امتیازی پہلو ''بین'' نظر آتا ہے کہ ہیرو کی موت پر اظہار رنج و غم کرنے اور اس کی لاش پر اس کے عزیزوں بالخصوص عورتوں اور بچوں کے رونے دھونے کو بین کہا جاتا ہے۔ بین مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کا سب سے آخری جز ہے۔ میر تقی میرؔ جب بین کرتے ہیں تو ان کا لہجہ گریہ وزاری میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے جس سے انسانی دل ہمدردی سے بھر جاتا ہے اور اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ چونکہ میرؔ ایک کامیاب غزل گو شاعر ہیں بالخصوص اپنے سوز و گداز کے لئے مقبول ہیں اس لئے وہ مرثیہ کے جز ''بین'' کو برتنے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں دوسری وجہ میرؔ کا وہ خاص مزاج ہے جس کو درد و الم جیسی کیفیات سے خاص علاقہ ہے۔ مثلاً

اندھیر شامیوں کے ستم سے بڑا ہوا
سر ہے سناں پہ شاہ کا تن ہے پڑا ہوا

خورشید ایک نیزے پر آکر کھڑا ہوا
محشر ہوئی جہاں میں عیاں وامصیبتا

زہرا نے دودھ جس کے تئیں مہر سے دیا
حیدرؑ نے جس کو سر پہ رکھا جب تلک جیا

آغوش میں نبیؐ نے جسے پرورش کیا
سر اس کا اور نوک سناں وامصیبتا

جس کے لئے سپہر رہا برسوں چرخ زن
جس کے لئے نمود میں آیا زمیں زمن

ہو سر کہیں نواسے کا اس کے کہیں بدن
پھر خاک میں ہوا نہ نہاں وامصیبتا

اردو مرثیوں کی خصوصیات میں جہاں دیگر عناصر شامل ہیں وہیں تصویر کشی کے فن پر بھی اس کی ادبیت کا انحصار ہے۔ مرثیہ میں تصویر کشی ایک فن کی صورت اختیار کر چکی ہے، جس کا التزام قدیم مرثیہ نگاروں کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ البتہ یہ تصویر کشی جدید مرثیہ نگاروں کے یہاں مکمل فنی لوازمات کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ مرثیہ ایک بیانیہ نظم ہے اور داخلی کے ساتھ ساتھ خارجی صنف بھی ہے۔ اس لئے اس میں تصویر کشی کے امکانات کافی بڑھ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ نگاروں نے واقعات، مناظر اور جذبات کی تصویر کشی میں ذہنی اختراع کا ثبوت دیا ہے۔ لہذا میر تقی میرؔ نے بھی شاعرانہ مصوری کے خوبصورت نمونے پیش کئے ہیں۔ اگر چہ مرثیہ میں ان کی تصویر کشی انیسؔ و دبیرؔ کے مماثل نہیں ہے اس کے باوجود اٹھارہویں صدی کی مرثیہ نگاری کے تناظر میں میرؔ کی یہ فنی خوبی قابل قدر ہے۔

میر تقی میرؔ کے یہاں تصویر کشی کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر جذبات کی عکاسی کی گئی ہے، جس کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ مرثیوں کا بیشتر حصہ کیفیات بیانی اور جذبات نگاری کی مرقع کشی میں ہی ختم کر دیتے ہیں، حتی کہ مناظر فطرت کو بیان کرتے وقت بڑی سرعت سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور داخلی کیفیات کی تصویریں پیش کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ان کے یہاں جنگ کے میدان اور اس کے ساز و سامان وغیرہ سے بھی گریز کیا گیا ہے۔ درحقیقت میرؔ نے کسی شئے کا ذکر کرنے کے بجائے اس سے مرتب ہونے والے تاثر کو زیادہ فوقیت دی

ہے، جبکہ تاثر (یعنی احساس) کا تعلق داخل سے ہے اور رزم، بزم کا تعلق خارج سے ہے، اسی لئے میرؔ کے یہاں داخل کی تصویر کشی کے زیادہ نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ اگر چہ مناظر فطرت بھی پیش کئے گئے ہیں اور واقعات نگاری بھی نظر آتی ہے لیکن اس طرح کے موقع پر میر تقی میرؔ نہایت اختصار سے کام لیتے ہیں اور جزئیات نگاری سے گریز کرتے ہوئے محض ان کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر تقی میرؔ نے جس رنگ کے مرثیے پیش کئے ہیں وہ ان کے عہد کی مرثیہ گوئی کا غالب رجحان تھا اور مرثیہ کی صنف فقط ''بین'' تک محدود تھی۔ البتہ بعد کے مرثیہ نگاروں کے یہاں دیگر خصوصیات کی تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا اور فن مرثیہ کی روایتی ترجیحات کے علاوہ اس میں جدید شاعری کی خصوصیات کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بقول احسن فاروقی:

> ''جدید شاعری کے اہم سوالات ہیں کردار نگاری، جذبات نگاری، ڈرامائی اثر، ایپک کی عظمت، تبلیغ اخلاق، فلسفیانہ معنی خیزی ان تمام امور میں مرثیہ کی کامیابی کی حدود پر بحث ہوسکتی ہے اور اگر ہم ایک طرف ہوکر ان کے مرثیوں میں وجود سے انکار بھی کریں تو بھی یہ کیا کم ہے کہ مرثیے ایسے سوال اٹھاتے تو ہیں'' (حوالہ: ''مرثیہ نگاری کا فن'' از: ڈاکٹر احسن فاروقی، مشمولہ مضمون: ماہنامہ سیپ ''اشاعت خاص بیادگار میر انیس''، شمارہ ۲۲ فروری، مارچ ۱۹۷۲ء، فحہ ۵۰)

جدید شاعری کے زیر اثر مرثیہ کی صنف میں جن خوبیوں کی تلاش کے امکانات پیدا ہوئے وہ کردار نگاری، جذبات نگاری، ڈرامائی عناصر، درس اخلاق اور حکیمانہ افکار جیسے نکات ہیں۔ جن کے اولیں نقوش جدید مرثیہ نگاروں سے قبل دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اگر چہ ان عناصر کا مطلع خوب واضح نہیں ہے لیکن ان کی تاریخی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مرثیہ محض داخلی جذبات کا بیان کر دینا ہی نہیں ہے بلکہ سانحۂ کربلا سے متعلق واقعات اور علاقات کے پس منظر میں داخلی احساسات کو ادبی پیرائے میں پیش کرنا اس کی بنیادی ترجیحات میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر اپنے احساسات کبھی واقعہ کے تناظر میں پیش کرتا ہے اور کبھی کردار کی زبان سے ادا کراتا ہے اور کبھی مناظر قدرت کا سہارا لے کر حزن و ملال کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ جب مرثیہ گو واقعات کا انتخاب کر کے ان کو نظم کرتا ہے تو اس کا یہ عمل واقعہ نگاری کہلاتا ہے، جس کا مفہوم ادباء کے یہاں مؤرخین کے برعکس ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> ''ایک مؤرخ کی نظر میں واقعات کا ظہور جس ترتیب اور جس نوعیت سے بیان ہوا ہو ان واقعات کو اسی طرح بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے بیان کر دیا جائے لیکن شاعری میں اس قسم کی واقعہ نگاری مستحسن نہیں ہوتی۔ یہاں واقعات پر تخیل

کے رنگین ولطیف پردے چڑھائے جاتے ہیں ہر واقعہ کی تفصیلات وجزئیات کو مشاہدے کی گرفت میں لایا جاتا ہے اور انہیں زبان وبیان کی ایسی دلآویزی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ ان واقعات کی دل کشی اصل واقعات سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے'' (میر انیسؔ حیات وشاعری، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، صفحہ: ۱۳۸)

میر تقی میرؔ کے یہاں واقعہ نگاری کے جو نمونے نظر آتے ہیں وہ ان کے شاعرانہ کمال کا پتہ دیتے ہیں۔ میرؔ کے مرثیوں میں ''مدینہ سے رخصتی، خطبۂ امام حسینؑ، حضرت قاسمؑ کی شادی، شہادت امام حسین، امام زین العابدینؑ کی بے کسی، خواتینِ اہل بیت کی بے حرمتی'' کے واقعات کو ہی بیان کیا گیا ہے۔ جن کو میرؔ نے اپنے تخیل اور تجربات ومشاہدات کی روشنی میں بڑی خوبصورتی سے تراشا ہے۔ انہوں نے جو واقعات پیش کئے ہیں ان میں مناسب جزئیات کے مربوط استعمال اور زبان وبیان کی دلآویزی سے ایسا تاثر پیدا کر دیا ہے کہ قاری اس واقعے کی فضا میں خود کو کھڑا ہوا پاتا ہے، جس کی روح واقعے میں اثر کر زمان ومکان کے احساس سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ مثلاً میر تقی میرؔ کی واقعہ نگاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو جب حضرت امام حسینؑ آخری حجت ثابت کرنے کے لئے شامی لشکریوں کے روبرو خطاب کرتے ہوئے ان کو نصیحت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود شامی دشمن آپ کو قتل کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ اس وقت کسی فرنگی کا میدان کربلا سے گزر ہوتا ہے جو اس منظر کو دیکھتا ہے اور اس کے ردعمل میں گویا ہوتا ہے اس پورے واقعے کو میرؔ نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

روایت ہے واں اک فرنگی بھی تھا
ہوا گوش زد اس کے یہ ماجرا

سبھوں سے مخاطب ہو اُن نے کہا
یہ ہے کون اے مردمِ زِشت فام

کہا ایک نے برگزیدہ ہے یہ
محمدؐ کا نورِ دو دیدہ ہے یہ

ہوا کیا جو آفت رسیدہ ہے یہ
علیؑ کا ہے فرزند خود ہے امام

وہ بولا کہ اے قوم جاہل ہو تم
شریرو! سیہ کار باطل ہو تم

سب اس شخص کے خوں کے مائل ہو تم
کہو جس کو فرزند خیرِ انام

مرثیہ میں رزم نگاری کی بھی بڑی اہمیت رہی ہے اور مرثیہ نگاروں نے اس جزء کو بیان کرنے میں نہایت ہی شاعرانہ ہنرمندی سے کام لیا ہے لیکن میر تقی میرؔ کے یہاں رزم کا سرسری ذکر آتا ہے البتہ رزم کے مرتب ہونے والے اثرات کا تفصیلی بیان ہوا ہے۔ایک موقع پر ان کی رزم نگاری ملاحظہ ہو جب حضرت قاسمؑ شامی لشکر کے روبرو پہنچتے ہیں تو میرؔ اس منظر کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ان کے مرثیوں میں اس طرح کی متعدد مثالیں تلاش کی جاسکتی ہیں:

نکلا جو خیمہ گاہ سے یہ مستعدّ کار
اک ابر سامنے سے اُٹھا اس کے فتنہ بار

تیروں کی بارش اُس سے تھی یا تیغ آبدار
طوفاں ہوا کہ اس کو یکا یک ڈُبا دیا

میر تقی میرؔ نے اپنی شاعرانہ مصوری میں مناظر فطرت کو بھی پیش کیا ہے۔مناظر فطرت کا بیان دراصل واقعہ نگاری کا ایک پہلو ہے کہ واقعہ نگاری ہی ترقی کر کے منظر نگاری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔منظر نگاری میں کسی واقعہ یا منظر کے اجزاء کو اس خوبی سے ترتیب دیا جاتا ہے کہ ایک مکمل تصویر بن جاتی ہے۔ادب میں اس کا اطلاق صرف مناظر فطرت کی عکاسی پر ہوتا ہے۔میر تقی میرؔ کے یہاں مناظر فطرت کی تصویر کشی کا ایک بند ملاحظہ ہو:

فرات! خاک سر اُس کے کہ جس کا ایسا آب
کہ جس سے موجیں اُٹھیں باہزار پیچ و تاب

تمام بادیہ کے وحش و طیر ہوں سیراب
دکھاویں تشنہ لبی سے زباں امام حسینؑ

مناظر فطرت کی عکاسی میں میر تقی میرؔ زیادہ سخاوت سے کام نہیں لیتے البتہ جب وہ کسی واقعہ یا جذبے کو پیش کرتے ہیں تو اس کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ قاری مجموعی تاثر کو قبول کرتے ہوئے میرؔ کی منظر نگاری کا بھی قائل ہو جاتا ہے کیونکہ میرؔ کا فنکارانہ ذہن واقعات اور احساسات کی مصوری میں زیادہ بیدار نظر آتا ہے۔لہذا ان کے یہاں جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔وہ جب کسی کردار کی داخلی کیفیت کو بیان کرتے ہیں تو اس کو ایسی چابکدستی سے بیان کرتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہو جاتی ہے اور قاری وہی اثر قبول کرتا ہے جو فنکار قائم کرنا چاہتا ہے۔جذبات کی مکمل تصویر کشی میں میرؔ کے حزنیہ مزاج کا بھی دخل ہوتا ہے جس کے سبب ان کی جذبات نگاری میں صداقت اور خلوص کی پاکیزگی شامل ہو جاتی ہے اور گہرا تاثر پیدا ہو جاتا ہے:

جہاں تاریک ہے بیٹے بھتیجے مرگئے سارے
رفیق ایک ایک گن کر دشمنوں نے جان سے مارے

جفائیں سہتے سہتے بازماندے شاہ کے ہارے
چراغ اک نیم کشتہ سا ہے باقی سو بھی مضطر ہے

قیامت سختیاں دیکھیں ہوا احوالِ دل برہم
توقع رحم کی کس سے رکھیں برگشتہ ہے عالم

نہیں آتا مصیبت پر ہماری کوئی مژگاں نم
مروت یاں نہیں ہے رسم، دل ہر اک کا پتھر ہے

جذبات نگاری میں میرؔ کا تخیل اس وقت عروج پر ہوتا ہے جب وہ مرثیہ کے کسی کردار کے ذریعہ اس کی قلبی کیفیت کو بیان کرتے ہیں اس وقت میرؔ جذبات واحساسات کی مکمل تصویر کشی کے لئے نہایت ہی نزاکت اور پرکاری سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ میرؔ ایک اچھے مثنوی نگار بھی ہیں اور مرثیہ بعض خوبیوں میں مثنوی کے مساوی ہے اس لئے میرؔ اپنے کرداروں کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے جذبات کو اس ہنرمندی سے بیان کرتے ہیں کہ ان میں فطری رنگ شامل ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب جذبات بیانی کے لئے کسی کردار کا انتخاب کرتے ہیں تب ان کے مرثیوں میں یہ جزء ایک اعلیٰ فنی خوبی میں ڈھل جاتا ہے جس سے میرؔ کے اعلیٰ شاعرانہ مزاج کا بھی علم ہوتا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو جس میں میرؔ نے اس موقع کی جذبات نگاری کی ہے جب حضرت امام حسینؑ میدان جنگ میں جانے کے لئے اپنی بہن سے رخصت ہوتے ہیں:

وقت رخصت کے جو روتی تھی کھڑی زار بہن
بولے شہ روؤ نہ بس اے مری غمخوار بہن

کیا کروں، جان کے دینے میں ہوں ناچار بہن
اب رہا روزِ قیامت ہی پہ دیدار بہن

ہائے یہ وقت نہیں طاقتِ دل کھونے کا
کڑھیو تب جب تجھے غم ہو نہ مرے ہونے کا

ابھی کیا رووے ہے آگے ہے سماں رونے کا
یاد آؤں گا بہت میں جگر افگار بہن

میر تقی میرؔ جذبات بیانی میں اس لئے بھی کامیاب نظر آتے ہیں کہ وہ اس کی اثر انگیزی کو بڑھانے کے لئے باریک انسانی پہلوؤں اور کیفیات پر گہری نظر رکھتے ہیں جس کا اندازہ درج ذیل بند سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب کسی شخص کو کوئی مصیبت درپیش ہوتی ہے تو وہ فرد ہی نہیں بلکہ اس کے گھر کے سبھی افراد متاثر ہوتے ہیں جس میں بچے بھی شامل ہوتے ہیں اس وقت بچوں کی پریشانی کو دور کرنے کے لئے گھر کے بڑے سہارا دیتے ہیں لیکن میرؔ نے میدان کربلا میں اس منظر کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ انسان کا دل شدید جذبات سے موجزن ہو جاتا ہے:

لیتے ہیں ترا نام جو سب شور و بکا کر
پوچھے ہے سکینہ تجھے ہر ایک سے آکر

دل جوئی کرے کون اُسے پاس بلا کر
ہم ایک مصیبت میں گرفتار حسینا

رنج ایک جو ہووے تو ہر اک اس کو اٹھالے
جی کوئی سنبھالے کہ سکینہ کو سنبھالے

تو کاش کہ اب سب کے تئیں پاس بلا لے
اس جینے سے ہم آئے ہیں بیزار حسینا

میرؔ کی کرداری نگاری مخصوص کرداروں تک محدود ہے۔ان کے مرثیوں میں میدانِ کربلا کے اہم کرداروں کا تذکرہ ہی ملتا ہے۔جن کی پیش کش میں ان کے حفظ مراتب کا خاص خیال رکھا گیا ہے جن کی نفسیات،عمر اور منصب و مرتبہ کی مناسبت سے ہی حرکات وسکنات انجام پاتے ہیں۔جن کے تعارف میں وہ تفصیل کے بجائے نہایت ہی اختصار سے کام لیتے ہیں۔لیکن جب امام زین العابدین کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے قلم کی قادرالکلامی بڑھ جاتی ہے یہی سبب ہے کہ امام زین العابدینؑ کا بیان بار بار دہرایا گیا ہے اور ان سے متعلق شدید غم انگیز جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کردار میں میر تقی میرؔ کو خود اپنی غم خواری بھی نظر آتی ہے یا یہ کہنا چاہئے کہ میرؔ کو بخوبی اندازہ ہے کہ اپنوں کو کھونے کے بعد کیسا محسوس ہوتا ہے۔جب کسی کے باپ، بھائی اور اقرباء ساتھ نہ ہوں تو وہ کس قدر مفلس ہوتا ہے جیسا کہ خود میر تقی میرؔ نے اپنے خونی رشتوں کا زخم سہا تھا اور زمانے کی بے مروتی و سنگ دلی بھی دیکھی تھی۔محرومی اور مظلومیت کے اعتبار سے امام زین العابدینؑ کے کردار میں میر تقی میرؔ اپنی ذات کو ٹٹولتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ جب امام زین العابدینؑ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی جذباتیت اور گریہ وزاری میں شدید اضافہ ہو جاتا ہے۔

دل سینے میں صد پارہ بے طاقت و بے چارہ
ناموس بیاباں میں یک شہر تھے آوارہ

سر باپ کا نیزہ پر کرتا تھا جو نظارہ
چاہے تھا کہ ناخن سے نوچوں سر و پیشانی

پس دست نہ تھا اس کو تھے ہاتھ رسن بستہ
رہ جاتا تھا سر دھن کر ناکام جگر خستہ

کہتا تھا پدر مر کر تو تو ہوا وارستہ
مجھ قیدی کی مشکل ہے آساں نہیں آسانی

مرثیہ ایک اخلاقی صنف بھی ہے جس میں اخلاقی پہلوؤں کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ جس کے ذریعہ مرثیہ کے ہیرو امام حسینؑ کے اعلیٰ کردار اور دیگر شہدائے کربلا کے بھی بلند اخلاق کا علم ہوتا ہے۔ مرثیہ نگار اپنے ہیرو کے فضائل اور اخلاق کو اس نزاکت اور ہنرمندی سے پیش کرتا ہے کہ وہ عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند ہو جاتا ہے لیکن یہ شاعرانہ ہنرمندی انسانی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے عمل میں لائی جاتی ہے تاکہ قاری کو جھوٹ اور مبالغہ کا گمان نہ ہو۔ چونکہ مرثیہ کے سبھی کردار تاریخی اور حقیقی ہیں اور ان کے کردار، حسن اخلاق وشمائل کو سیرت نگاروں نے مضبوط روایت کی بنیاد پر محفوظ کر دئے ہیں جن کو مرثیہ نگار اپنی قادرالکلامی سے اس خوبی سے پیش کرتا ہے کہ اس میں گہرا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ بطور نمونہ تین بند ملاحظہ ہوں:

نہ کوئی مرا یارو یاور رہا
نہ قاسمؑ رہا ہے نہ اکبرؑ رہا

جسے دیکھتا ہوں سو وہ مر رہا
مرے اقربا تم نے مارے تمام

یہ کرتا ہوں میں تم سے پیمان اب
کہ ناموس اپنے اٹھاؤں گا سب

کسو اُور جاؤں گا چھوڑا عرب
حبش، ہند اپنا کروں گا مقام

نہ دعوی کروں گا قیامت کو بھی
کیا پیشکش میں امامت کو بھی

گوارا کیا سب ملامت کو بھی
نہ یاں کی مصیبت کا واں لوں گا نام

درج بالا بندوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مرثیہ کے ہیرو امام حسینؑ کے اخلاق کس قدر بلند ہیں کہ انہوں نے ایسے وقت میں بھی اپنے نانا کی امت پر نرمی روا رکھی جب کہ سبھی مرد اہل خانہ شہید ہو چکے تھے اور دوست واحباب بھی جام شہادت پی چکے تھے اور دشمنِ امام حسینؑ اب آپ کی جان کے درپے تھے۔ لہذا اتمام حجت کے لئے ان کو اس گناہ عظیم سے باز رکھنے کی آخری کوشش کی اور دنیا و آخرت میں ان سے بے نیازی کا وعدہ کیا تا کہ ان کے نانا کی امت دنیوی واخروی ذلت وخواری سے محفوظ رہے۔

میر تقی میرؔ کے مرثیوں میں مکالمہ نگاری کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مکالمہ نگاری دراصل دو یا اس سے زیادہ کرداروں کے درمیان جاری گفتگو کو کہتے ہیں۔ اچھی مکالمہ نگاری کے لئے شاعر کو انسانی نفسیات کا علم ہونا ضروری ہے۔ چونکہ مکالمے کرداروں کی زبان سے ادا ہوتے ہیں جو ان کے ذہنی رویوں اور دلی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں لہذا شاعر جس قدر نفسیات کا ماہر ہوگا اس کے مکالمے بھی اسی قدر جاندار ہوں گے۔ چونکہ انسانی نفسیات کا علم ہی ہمیں یہ شعور عطا کرتا ہے کہ کب اور کس کے ذریعہ کون سی بات ادا کرانی ہے یعنی مکالموں میں فطری گفتگو کی کیفیت کا پایا جانا کامیاب مکالمہ نگاری کی صفت ہے۔ اگر چہ میر تقی میرؔ کے مکالمے بھی خوب ہیں لیکن ان میں وہ فنی خوبی نہیں پائی جاتی جو بعد کے مرثیہ نگاروں میں نظر آتی ہے یعنی ان کے یہاں جو مکالمہ نگاری نظر آتی ہے اس میں وہ ڈرامائی رنگ نہیں پایا جاتا جو مکالموں کی روح ہے، چنانچہ ان کے مکالموں کے ربط وتسلسل میں حرکت وعمل کی کمی نظر آتی ہے۔ جن کو پڑھ کر ہمدردی تو پیدا ہوتی ہے لیکن جوش وگرمی کا احساس کم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میر کے مکالمے سادگیٔ زبان اور فطری بیان کے اعلیٰ نمونے ہیں، ایک نمونہ ملاحظہ ہو جس میں میر تقی میرؔ نے نہایت کامیابی کے ساتھ انسانی فطرت کے اسرار کو بے نقاب کیا ہے اور دونوں کرداروں ''چچا اور بھتیجے'' کے درمیان ہوئی گفتگو سے ان کے باہمی ربط، دلی تعلق، عزت واحترام، شفقت ومحبت وغیرہ جیسی کئی خصوصیات سے واقف کرایا ہے کہ قاسمؑ بن حسنؑ جب اپنے چچا (امام حسینؑ) سے جنگ میں شہید ہونے کے لئے اجازت طلب کرتے ہیں تو کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

قاسمؑ چراغ بھائی کا آیا پتنگ ہو
کہنے لگا کہ میرے تئیں حکمِ جنگ ہو

تا چند زندگانی وبال اور ننگ ہو
افسردگی کہاں تئیں جیسے بجھا دِیا

اپنے محبوب بھتیجے اور مرحوم بھائی (امام حسن) کی آخری نشانی کو شہید ہونے کے لئے کس طرح اجازت دیں اس کا ذکر میر تقی میرؔ نے کچھ اس طرح کیا ہے کہ مکالمہ نگاری میں جان پڑ جاتی ہے:

بولا چچا کہ دل میں جو کرتا ہوں میں تمیز
پاتا ہوں اپنے بیٹوں سے بھی تیرے تئیں عزیز

تیرے عوض جہاں کو اگر دیں تو کیا ہے چیز
ہونے نے تیرے بھائی کے غم کو بھلا دیا

یہ سن کر قاسمؑ اپنے چچا کو کس طرح اپنے حق میں مناتے ہیں اس کا ذکر بھی میر تقی میرؔ نے ایک ماہر نفسیات کی طرح کیا ہے:

اس ماجرے کو گرچہ دیا اُس جواں نے طول
پر بات اس کی کوئی چچا نے نہ کی قبول

جب دیکھا مدعا نہیں ہوتا ہے یوں حصول
بازو سے کھول باپ کا اپنے لکھادیا

جب قاسمؑ اپنے بابا (امام حسنؑ) کا لکھا ہوا وہ تعویذ دکھاتے ہیں جس میں انہوں نے اپنے بھائی کا سہارا بننے کی وصیت کی تھی تو امام حسینؑ پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟، اس کے جواب میں میر تقی میرؔ نے جو مصرع ''لکھ دے گیا تھا مجھ کو دمِ مرگ یہ پدر'' لگایا ہے وہ ان کے ماہر نفسیات ہونے پر دلیل ہے۔

پوچھا کہ کیا ہے یہ تو کہا کیجئے نظر
لکھ دے گیا تھا مجھ کو دمِ مرگ یہ پدر

پڑھتے ہی اس کے خون ہوا غم سے سب جگر
مغموم ہوکے فرقِ مبارک جھکا دیا

بہترین ادب وہ خیال کیا جاتا ہے جس میں مزاحمت اور احتجاج کی جلوہ نمائی ہو۔ جو فن پارہ مزاحمت یا احتجاج کی صفت رکھتا ہے وہی آفاقی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مرثیہ میں جو واقعات پیش کئے جاتے ہیں ان کے بیان کا کلیدی مقصد شر اور باطل کے خلاف مزاحمت کرنا اور احتجاج بلند کرنا ہوتا ہے۔ یہی صحت مند ادب کا مقصد بھی ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے مرثیہ کی صنف سب سے زیادہ مفید اور کارآمد خیال کی جاتی ہے۔ میر تقی میرؔ کے مرثیوں میں بھی باطل کے خلاف بھرپور احتجاج نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں ان کے مرثیوں کا موضوع ہی احتجاج قرار پاتا ہے۔ اگر کسی مرثیہ میں احتجاج کی واضح لَے نہیں سنائی دیتی ہے تو اس کی جگہ مزاحمت کی لَو ضرور دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح میر تقی میرؔ ایک مزاحمتی اور احتجاجی شاعر بھی قرار پاتے ہیں جس کا عکس ان کے مرثیوں میں نظر آتا ہے:

پھر گئی کیا آہ یک باری ہوا
اُڑ گئے سب طائران خوش نوا

کیا زمانے نے ستم رکھا روا
جائے بلبل زاغ بیٹھے پھول پھول

میر تقی میرؔ جس عہد میں مرثیے لکھ رہے تھے وہ اٹھارہویں صدی کا دور تھا، اردو زبان رفتہ رفتہ نکھر رہی تھی اور بہت سے ایسے الفاظ، تراکیب اور محاورے مستعمل تھے جو اب متروک ہو چکے ہیں، اگر عہد حاضر کا قاری ان متروک الفاظ کی قرأت کرنا چاہے تو بغیر مشق کے ان کی درست ادائیگی ممکن نہیں کیونکہ اب اظہار کے طریقے بدل چکے ہیں مثلا اب ''کہے تھا'' کی جگہ ''کہتا تھا''، ''سنے تھا'' کی جگہ ''سنتا تھا'' اور کوں، سوں، نیں، سیں'' کی جگہ ''کو، سو، نے، سے'' مستعمل ہے۔ اسی طرح زبان میں بے شمار تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر کا ذہن جو ترقی یافتہ اردو زبان سے مانوس ہے قدیم مرثیوں سے کما حقہ محظوظ نہیں ہو پاتا۔ میرؔ نے اپنے مرثیوں میں ہندی/بولی کے الفاظ کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ مرثیہ عوامی صنف ہے اس لئے میرؔ نے عوام میں مروج ہندی/بولی کے الفاظ (اچرج، بسرنا، دوس، پات، چٹانا، گارا، نوا، جوگ، سوگ، بچن، تنک، ندان وغیرہ) کو بکثرت استعمال کیا ہے تا کہ مرثیہ کی افادیت کا دائرہ محدود نہ رہے۔ بقول مسیح الزماں اس دور کے مرثیہ گویوں کا یہی طریقہ بھی تھا:

> ''ان کے مرثیے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے ہندی کے لفظ ہیں جو اردو کے دوسرے اصناف میں استعمال نہیں کیے جاتے مگر مرثیوں میں جگہ پاتے ہیں۔ گویا مرثیہ گویوں کے فنی لوازم ہی اور اصناف سے علیحدہ ہیں۔ یہ شاید اس وجہ سے ہو کہ مرثیے عوام کو رلانے اور انھیں متاثر کرنے کے لیے لکھے جاتے تھے اس لیے ان میں ایسے الفاظ بھی استعمال کیے گئے جو امراء اور اہل علم کی زبان پر نہیں تھے لیکن عوام میں رائج تھے'' (مقدمہ، مراثی میرؔ، مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ، صفحہ: ۳۳)

لیکن شاعری میں کسی دوسری زبان کے الفاظ کا استعمال کرنا آسان کام نہیں ہے چونکہ ایسی صورت میں انسانی ذہن غیر زبان کے الفاظ و تراکیب کا رس سمجھنے سے قاصر رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ میر تقی میرؔ کے بعض اشعار میں غیر مانوسیت کا احساس ہوتا ہے لیکن بعض جگہ وہ ہندی الفاظ کو اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ شعر میں لطف پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً

جوش و خروش سے یوں دریائے خوں نہ بہتا
لوہو سے اقربا کے ہوتی نہ خاک گارا

جانوں سے مارا، خیمہ جلایا
پانی کے بدلے لوہو چٹایا

سن کر بلا کا ہنگامہ و شور
غم سے کماں ساں ہر دم نوا کر

نعل سینوں پر جڑیں گے اور سر پھوڑیں گے لوگ
کھینچیں گے کتنے الف داغ اور کتنے لیں گے جوگ

ابر اس ماتم سرا میں رکھیں گے اس شہ کا سوگ
حلقہ حلقہ لوگ ہوں گے، نوحہ ہوگا درمیاں

میرؔ کے مراثی زبان وبیان میں نہایت ہی دلآویز ہیں،وہ اپنے مرثیوں میں مشکل عربی وفارسی کے الفاظ اورتراکیب کا استعمال خال خال ہی کرتے ہیں،زبان کی سادگی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں کیونکہ ان کو بخوبی اندازہ تھا کہ مرثیہ ایک عوامی صنف ہے لہذا زبان وبیان کی پیچیدگی سے گریز کرتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کے مرثیے صنائع وبدائع کی صفات سے عاری ہیں بلکہ وہ ان کا استعمال بھی بڑی لطافت اور سادگی سے کرتے ہیں جو قریب الفہم ہوتے ہیں البتہ کچھ مرثیوں میں انہوں نے زبان وبیان کے جوہر بھی دکھائے ہیں لیکن زیادہ تر مرثیوں میں سادگی پائی جاتی ہے۔مبالغہ،تشبیہ مجاز مرسل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

نہیں ان کلفتوں کی تاب لائی جاتی اب ہم سے
لپٹ سی ہونٹ کو لگنے لگی ہے گرمی دم سے

درونی جل گئی شاید ہماری آتشِ غم سے
ٹپکتا آنکھ سے آنسو جو ہے گویا کہ اخگر ہے

جل کے جگر ہے راکھ کی ڈھیری اورتوَا ہر چھاتی ہے
جوش غبار ملال اٹھے پر آندھی سی اک آتی ہے

پات اور بُن ہیں جیسے سوکھے جانیں اُڑا لے جاتی ہے
پہنچے ہے تا عرش اعظم خاک ہماری اُڑائی ہوئی

اعوان یوں تلف ہوئے کٹتی ہے جیسے گھانس
انصار اس طرح کٹے وحشی ہوں جوں اداس

کرتا تھا وہ آنکھوں سے خون جگر افشانی
دریا کے کنارے پر پاتا نہ تنک پانی

میرؔ کے مرثیوں میں جو صنائع بدائع کا استعمال ملتا ہے وہ نہایت ہی خوبصورت ،لطیف پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔کبھی کبھی میرؔ کا تخیل مرثیہ کے غم آلود صحرا میں نازک خیالی کے ایسے پھول بھی کھلاتا ہے جن کی لطافت اور نزاکت سے ادبی ذوق کو سیرابی حاصل ہوتی ہے۔میرؔ نازک سے نازک ترین خیال کو اس ہنرمندی سے نظم کرتے ہیں گویا شبنم کا قطرہ پھول کی پتی سے ڈھلک کر ہتھیلی پر آ گرا ہو۔اس میں کوئی شک نہیں کہ میرؔ کی زبان سادگی میں پرکاری کا مزہ رکھتی ہے کہ سادگی کے باوجود لطافت اور شیرینی سے خالی نہیں۔ان کی نازک خیالی کے دو بند ملاحظہ ہوں:

مژہ میں لخت جگر اپنے میں پروتا ہوں
کباب آتش غیرت کے بیچ ہوتا ہوں

حرم کے لوگوں کو میں دیکھ دیکھ روتا ہوں
پھر اس پہ ان کی یہ آہ و فغاں امام حسینؑ

آرایش بزم کیا کہیے بارے
آہوں کے شعلے گل ریز سارے

گرتے تھے آنسو جیسے ستارے
چھوٹے تھی منھ پر سب کے ہوائی

10.3.1 متن (مرثیۂ میر تقی میرؔ)

(۱)

حسینؑ ابن علی عالی نسب تھا
سزاے عزت و باب ادب تھا

جفا و جور کا شائستہ کب تھا
سلوک اسلامیاں سے یہ عجب تھا

کہ اس مہمان کی عزت نہ کیجئے
ضیافت یک طرف پانی نہ دیجئے

(۲)

کسو کافر سے ایسا ہو نہ کردار
ہوا اسلامیوں سے جو باصرار

کجی رفتار کی، تلخئ گفتار
تِس اوپر کھینچ کر ہر اک نے تلوار

بہت بے ڈول اس پر آزمائ
علیؑ کے مونہہ سے کچھ بھی شرم آئ؟

(۳)

محمدؐ جس کی سب امت کہاویں
اسی کی آل کا لوہو بہاویں

علیؑ سن کر جسے سب سر جھکاویں
اسی کے گھر کو بِن پانی رلاویں

زہے اسلام، نادر لوگ، خوش دور
عجب آئیں، عجب ایماں، عجب طَور

(۴)

اسے ماریں جسے دیں کی امامت
نہ ہووے پھر کسو کو کچھ ندامت

کریں برپا ستم ہے اک قیامت
علاوہ اس پہ تشنیع و ملامت

حیا مطلق نہ غارت سے کسو کو
نہ بہرہ کچھ مروت سے کسو کو

(۵)

اسے بیکس جو پایا مار ڈالا
رکھا میداں میں سر کو نیزہ بالا

پسر کو کانپتا گھر سے نکالا
بٹھائیں عورتیں رستے پہ لا لا

نہ کچھ کی دل دہی زین العبا کی
نہ کچھ روئے محمدؐ سے حیا کی

(۶)

علیؑ کے تئیں موا جانا سبھوں نے
محمدؐ کو نہ کچھ مانا سبھوں نے

بُرا شبیرؑ کا ٹھانا سبھوں نے
کیا اس گھر کو ویرانہ سبھوں نے

رہا تنکا سا عابد کشمکش میں
حرم کے لوگ بے حالی سے غش میں

(۷)

علیؑ اکبر کہ تھا شکل محمد
طرف اس ایک کے ہوتے تھے صد صد

اٹھائے ان نے جس دم زخم بے حد
لگا منھ کر نجف کو کہنے اے جد

ستم ہے، شور ہے، جور و جفا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا ہے

(۸)

پڑی تھی دھوپ میں وہ لاش مظلوم
کسو کا دل تنک ہوتا نہ تھا موم

اسیری، اور غارت کی مچی دھوم
تردد شہ کے لے جانے کا معلوم

رہا تھا عابدؑ سو زار و بیمار
نہ جس کی کچھ دَوا نے جس کا تیمار

(۹)

زناں مویہ کناں سب خاک بر سر
کہیں تھی رو مدینے کی طرف کر

کہ منصف ہو ٹک اے ختم پیمبرؐ
مصیبت کس قدر ہے آل اوپر

کہیں کس سے کوئی حاکم نہیں ہے
نہ تو ہے نے امیرالمومنینؑ ہے

(۱۰)

ریاست کے لئے شبیرؑ مارا
بھلا یوں اس کی تھی تقدیر مارا

سبھوں کو کیوں ہے بے تقصیر مارا
علی اصغرؑ کے پھر کیوں تیر مارا

چھنائیں عورتوں کی کیوں رِدائیں
روا کاہے کو رکھیں یہ جفائیں

(۱۱)

چلا سر کٹ کے اس جانِ جہاں کا
گِرا ہے خاک پر خوں ہر جواں کا

ہوا ستھراؤ یوں خرد و کلاں کا
مقرر لوٹنا ہے خانماں کا

کِسو ملت میں ایسا بھی ہوا ہے؟
نیا وارث ہمارا ہی موا ہے؟

(۱۲)

سکینہ کا گنہ کیا ہے بتاویں
پدر مردہ کو کس خاطر کڑھاویں

کہاں فریاد لے کر ہائے جاویں
کسے یہ ماجرا سارا سناویں

جفا ہر لحظہ ہم سب پر نئی ہے
حیا اک رسم تھی سو اٹھ گئی ہے

(۱۳)

حسنؑ تو تھا خلیفہ جس کو مارا
گنہ قاسمؑ کا کیا جو اِس کو مارا

کہوں میں کب تلک کس کس کو مارا
ستم سے، جور سے جس تِس کو مارا

رہا وارث نہ غیر از عابدیں کے
پڑے ہیں خاک میں ارکان دیں کے

(۱۴)

سو ٹپکے ہے لہو اس کے سخن سے
بندھے ہیں ہاتھ دونوں اک رسن سے

ہوا ہے اب اسیر آکر وطن سے
پدر محروم ہے اب تک کفن سے

کہاں مہلت کہ شہ کے تئیں اٹھاویں
نہیں فرصت کہ ٹک رو کر بھی جاویں

(۱۵)

جلے خیمے لٹا گھر بار سارا
ہوا کنبہ سبھی بندی ہمارا

جوان و پیر سب کو تشنہ مارا
اگرچہ یہ تھا دریا کا کنارہ

پہ قطرہ آب کا در و گہر تھا
کہ لب خشکی سے ہر اک چشم تر تھا

(۱۶)

کرے عابدؑ کہاں تک غمگساری
جسے بیماری و تن کی نزاری

کھنچی ہے دور تک اپنی یہ خواری
اٹھانا پاؤں کا اس پر ہے بھاری

ہو ایسے حال میں کیوں کر دلاسا
کرے کس کس کی دلداری وہ پاس آ

(۱۷)

کہیں زینبؑ بہن، زہراؑ سے، مادر
کرے گا کون اب ہم سوں کا آدر

پڑا ہے خاک میں بے سر برادر
لیے جاتے ہیں چھینے سر کی چادر

کہاں لے جاؤں بھائی کو اٹھاکر
اڑاؤں خاک کس کے آگے جاکر

(۱۸)

ہمیں بازار میں لاکر بٹھایا
کیا پامال ایسا سر اٹھایا

تسلی کو بھی کوئی ٹک نہ آیا
کفن جی سے کسو نے بھی نہ پایا

ستم پر ہے ستم یہ، جور پر جور
زمانہ ہوگیا پل مارتے اور

(۱۹)

سکینہؑ جب کرے ہے باپ کو یاد
قیامت ایک ہو جاتی ہے بنیاد

اٹھے ہے ہم اسیروں میں جو فریاد
تو یہ کرتے ہیں ظلم اک اور ایجاد

کہاں مقدور یہ اس ناتواں کا
کہ ہووے پیش رو اس کا رواں کا

(۲۰)

نظر میں باپ کا سر ہے سناں پر
پڑے ہے آنکھ لوٹے کارواں پر

بنے ہے آن کر ہر گام جاں پر
مصائب ہیں غرض اس ناتواں پر

ابھی میداں میں دس جاگہ گھرا ہے
چلا جاتا نہیں پر رہ گرا ہے

(۲۱)

جو رکتا ہے بہت تو رو اٹھے ہے
جو گرتا ہے تو طاقت کھو اٹھے ہے

کہے ہے یوں تو شور اک ہو اٹھے ہے
کہ دیکھوں باپ کب تک سو اٹھے ہے

سر رہ قافلہ ہے کوئی بولو!!
کہ دو رخصت اسے ٹک آنکھ کھولو

(۲۲)

ہوئے سب شام کو آخر روانا
کہ جن کو ٹھور تھی نے کچھ ٹھکانا

بہت بے دردیوں پر تھا زمانا
کچھ آگے شرح و بسط اچھا نہ جانا

قلم کو میرؔ میں نے توڑ ڈالا
سَر اپنا پتھروں سے پھوڑ ڈالا

10.3.2 ماحصل

میر تقی میرؔ نے دیگر اصنافِ سخن کی طرح مرثیہ پر بھی اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ان کے مرثیوں میں بین پر زیادہ زور دیا گیا ہے اگر چہ میرؔ مرثیہ کے دوسرے اجزائے ترکیبی پر بھی توجہ دیتے ہیں لیکن ان کا بیان مبہم اور دھندلا ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی شناخت کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔البتہ جدید شاعری کی رو سے کردار نگاری، مکالمہ نگاری، واقعہ نگاری وغیرہ جیسی خصوصیات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔تصویر کشی میں میرؔ کی جذبات نگاری ان کے کمال فن کا نمونہ ہے جس کا سبب میرؔ کا وہ مزاج ہے جس کا علاقہ حزن وملال سے ہے۔کردار نگاری کا التزام بھی نظر آتا ہے لیکن جس توجہ اور تفصیل سے وہ امام زین العابدینؑ کا کردار پیش کرتے ہیں اس کے سامنے دوسرے کردار پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔لیکن وہ ہر کردار کو اس کی نفسیات اور فرق مراتب کے لحاظ سے مقام

ومرتبہ عطا کرتے ہیں اور مکالمے ادا کراتے ہیں۔ان کے مکالمے نہایت ہی سادہ اور فطری ہوتے ہیں جو دلآویز زبان میں پیش کئے جاتے ہیں۔میرؔ کی واقعہ نگاری بھی تاثر سے خالی نہیں وہ جب واقعات بیان کرتے ہیں تو طولانی سے گریز کرتے ہوئے اپنے اصل مدعا ''بین'' پر آجاتے ہیں۔ان کی واقعہ نگاری کے مخصوص واقعات حضرت قاسم کی شادی،علی اصغر اور سکینہ کی پیاس،اہل بیت کی عورتوں کی بے حرمتی اور امام زین العابدینؑ کی اسیری تک محدود ہیں۔مجموعی طور پر ان کے مجموعی مرثیوں کو دیکھا جائے تو وہ موضوع،مواد اور پیشکش کے اعتبار سے اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں اگر چہ سوداؔ کے مراثی بعض خوبیوں میں میرؔ کے مرثیوں سے زیادہ بلند ہیں۔میرؔ نے اپنے عہد کے رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کو بھی پیش کیا ہے جن سے اس دور کی عزاداری پر روشنی پڑتی ہے لیکن اب وہ قدریں کافی حد تک بدل چکی ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ میرؔ کے مرثیے رنج وغم، سوز وگداز اور اثر آفرینی جیسی خوبیوں کے حامل ہیں۔جن سے بظاہر امام حسینؑ کی مظلومی کا پتہ چلتا ہے لیکن میرؔ کے لہجے اور زبان و بیان کے بغور جائزے کے بعد خلاصہ ہوتا ہے کہ میرؔ ظلم واستبداد کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کررہے ہیں۔بعض اوقات ان کا یہ احتجاج کافی شدید ہوجاتا ہے۔میرؔ کے مرثیے ان کے مخصوص لب ولہجے کے ترجمان ہیں جن کی زبان سادہ، بے تکلف اور روزمرہ کے استعمال پر مبنی ہے۔انہوں نے سہل ممتنع کا ایسا طرز اختیار کیا جس کو اگلے زمانے میں میر انیسؔ نے بلندی عطا کی۔میرؔ نے اپنے مرثیوں کو محض بیانِ واقعۂ کربلا،گریہ وزاری اور حصول ثواب تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں اعلیٰ ادبی قدریں بھی پیش کیں جن سے مرثیہ کو فنی اور ادبی سمت ورفتار عطا ہوئی۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی میں آپ نے سیکھا ہے کہ:

۱۔ میرؔ کے مرثیے اپنے عہد کی ادبی قدروں کے ترجمان ہیں جن کی تاریخی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ میرؔ کے مرثیوں میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ متاخرین مرثیہ گویوں کے یہاں درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہیں۔گویا میرؔ کے مرثیے جدید اور قدیم کی درمیانی کڑی ہیں۔

۳۔ مرثیہ کی روایتی ترجیحات میں میر تقی میرؔ بین کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔

۴۔ اگر چہ میرؔ نے سانحۂ کربلا کے بیشتر اہم کرداروں کو پیش کیا ہے لیکن وہ امام زین العابدین کے کردار کو زیادہ شدت جذبات سے بیان کرتے ہیں۔

۵۔ جدید نظم کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مراثی میرؔ کا مطالعہ ہمیں مایوس نہیں کرتا۔کیونکہ ان کے مرثیوں کی ادبیت اور فنکاری مرثیہ میں نئی سمت ورفتار کا اشارہ دیتی ہے۔

10.5 اپنا امتحان خود لیجئے

۱۔ میر تقی میرؔ کے دستیاب مرثیوں کی تعداد مع ان کی ہیئتوں کے قلم بند کیجئے۔

۲۔ بین کسے کہتے ہیں وضاحت کیجئے۔

۳۔ میر تقی میرؔ نے اپنے مرثیوں میں سب سے زیادہ کس کردار پر توجہ دی ہے؟ وضاحت کیجئے۔

۴۔ میر تقی میرؔ کی مرثیہ نگاری کی دو نمایاں صفات لکھتے ہوئے مثالیں پیش کیجئے۔

۵۔ عہدِ میرؔ کے دو مرثیہ نگار شعراء کے نام لکھئے۔

10.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ میر تقی میرؔ کے دستیاب مرثیوں میں 34 مرثیے ہیں۔ جن کو ڈاکٹر مسیح الزماں نے ''مراثی میرؔ'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ مرثیے مختلف ہیئتوں میں لکھے گئے ہیں جن میں 27 مرثیے مربع، ایک ترکیب بند مثمن، دو مسدس، ایک ترجیع بند مسدس اور تین قصیدہ نما مرثیے ہیں۔

۲۔ میر تقی میرؔ کے یہاں بین پر کافی زور دیا گیا ہے۔ ہیرو کی موت پر اظہارِ رنج والم کرنے اور لاش پر اس کے عزیزوں بالخصوص عورتوں اور بچوں کے رونے کو بین کہا جاتا ہے۔ بین مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کا سب سے آخری جز ہے۔

۳۔ میر تقی میرؔ اپنے مرثیوں میں امام زین العابدین کی کردار نگاری پر بہت زور دیتے ہیں اور ان کے احساسات وجذبات کا بڑی باریکی سے جائزہ لیتے ہیں۔ امام زین العابدین کا کردار میرؔ کو اس لئے بھی متاثر کرتا ہے کہ یاس ومظلومی کے اعتبار سے دونوں کے دکھ برابر ہیں۔ ایک کو غیروں سے ایذا پہنچی اور دوسرے کو اپنوں سے دکھ ملا۔ دونوں کے درمیان حزن وملال کا تعلق ہے۔ اس لئے میرؔ کی طبیعت اس کردار کے واقعات اور واردات بیان کرنے میں زیادہ دلچسپی دکھاتے ہیں۔

۴۔ میر تقی میرؔ کی مرثیہ گوئی کی نمایاں صفات میں سب سے اہم صفت ''بین'' ہے۔ جس کا رنگ ان کی پوری مرثیہ گوئی پر حاوی ہے۔ وہ جب 'بین' کرتے ہیں تو جگر پاش پاش ہو جاتا ہے اور رقت سی طاری ہو جاتی ہے۔ میرؔ جب بین کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر کے شاعر کی مجموعی صلاحیتیں بیدار ہو گئی ہیں۔ ان کے مرثیوں کی دوسری اہم صفت ''جذبات نگاری'' ہے۔ جس کو بیان کرنے میں وہ بڑی ہنرمندی اور نفسیاتی مہارت سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ میرؔ بخوبی جانتے ہیں کہ انسان کے دل میں کب؟ کس طرح کے جذبات؟ پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان کا اظہار کس طریقے سے کرتا ہے، میرؔ کی مذکورہ دونوں خوبیوں کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

اندھیر شامیوں کے ستم سے بڑا ہوا
سر ہے سناں پہ شاہ کا تن ہے پڑا ہوا

خورشید ایک نیزے پر آکر کھڑا ہوا
محشر ہوئی جہاں میں عیاں وامصیبتا

وقت رخصت کے جو روتی تھی کھڑی زار بہن
بولے شہ روؤ نہ بس اے مری غمخوار بہن

کیا کروں، جان کے دینے میں ہوں ناچار بہن
اب رہا روزِ قیامت ہی پہ دیدار بہن

۵۔ میر تقی میرؔ کے عہد میں متعدد اہم مرثیہ گو نظر آتے ہیں، جن میں سوداؔ اور حزیںؔ کے نام سرفہرست ہیں۔

10.7 فرہنگ

شایستہ	:	تربیت یافتہ، تعلیم یافتہ
سلوک	:	برتاؤ
ضیافت	:	دعوت، مہمانی
کسو	:	کسی (اردو میں متروک ہے)
تلخیٔ گفتار	:	کڑوی گفتگو
تِس اُوپر/تِس پر	:	اس پر، اس پر بھی، اس کے باوجود
طَور	:	طریقہ
تشنیع	:	بےعزت کرنا
دل دہی	:	خبر گیری
تئیں	:	آپ کو، خود، لئے، واسطے، کو
مویہ	:	گریہ، زاری، رونا، ماتم
بےحالی	:	برے حال

غش	:	بے ہوشی
موا	:	مرا ہوا، مردہ
خردوکلاں	:	چھوٹا بڑا
خانماں	:	گھر کا اسباب
رَسَن	:	رسی
کُنبہ	:	خاندان، اہل وعیال
بندی	:	قیدی
نزاری	:	کمزوری
مادَر	:	ماں
آدَر	:	عزت، تعظیم
برادَر	:	بھائی
پامال	:	بے عزت، رسوا
ٹُک	:	کچھ، تھوڑا، ذرا، ذرا سی دیر
ٹھور	:	پناہ، ٹھکانا

10.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ مراثی میرؔ — مرتبہ: ڈاکٹر مسیح الزماں

۲۔ اردو مرثیے کا ارتقاء (ابتداء سے انیسؔ تک) — مصنف: ڈاکٹر مسیح الزماں

۳۔ میر تقی میرؔ حیات اور شاعری — مصنف: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

۴۔ اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء — مصنف: ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری

۵۔ میر اور میریات — مصنف: صفدر آہ